ترقی پسند ادب کا ترجمان

انگارے

مرتبہ

سیّد عامر سہیل

ماہانہ کتابی سلسلہ

بارہویں کتاب

دسمبر ۲۰۰۳ء

مراسلت: ۵۴۵/c گل گشت کالونی، ملتان

ای میل: angarey@poetic.com

مطبع: عاتکہ پرنٹنگ پریس، ملتان

قیمت: بیس روپے

ترتیب

۱۔ چند باتیں — سید عامر سہیل — ۳

مضامین:

۲۔ پروفیسر گیان چند کے مقالے سے متعلق — ڈاکٹر انصار اللہ — ۴
۳۔ کچھ وقت ڈاکٹر اعجاز راہی کے ساتھ — ڈاکٹر انور سدید — ۱۱
۴۔ حرفِ زیرِ لب ___ ایک جائزہ — رفعت سروش — ۱۴
۵۔ ''نامعلوم'' کی دُنیا — غلام حسین ساجد — ۱۹
۶۔ ادب اور معروضیت (جمالیات-۲) — ابن حسن — ۲۹
۷۔ ''دل بھٹکے گا'': ناول یا آپ بیتی — خالد محمود سنجرانی — ۳۸

کہانی:

۷۔ ایکسٹیسی — احمد ندیم تونسوی — ۴۲
۸۔ بوڑھا آدمی — دلفینی دُومورئیر / ڈاکٹر شگفتہ حسین — ۴۵

سلسلہ وار ناول:

۸۔ ایک مرد قسط نمبر ۶ — اوریانا فلاشی / خالد سعید — ۵۷

شاعری:

۹۔ دو غزلیں — ڈاکٹر خیال امروہی — ۶۸
۱۰۔ دو غزلیں — پرویز ساحر / سجاد مرزا — ۶۹
۱۲۔ دو غزلیں — فہیم شناس کاظمی / رسا چغتائی — ۷۰
۱۴۔ دو غزلیں — قاضی حبیب الرحمٰن — ۷۱، ۷۲
۱۵۔ دو غزلیں — کاشف حسین / شاہد ملک — ۷۳
۱۶۔ دو غزلیں — عطاالرحمٰن قاضی / فیروز شاہ — ۷۴
۱۷۔ غزل — احمد صغیر صدیقی — ۷۵
۱۸۔ نظم (فاعبتر و۔۔۔) — احمد صغیر صدیقی — ۷۵
۱۹۔ دو نظمیں — خالد ریاض خالد — ۷۶

حروفِ زر (قارئین کے خطوط):

۲۰۔ بنام مرتب — ۷۷

سید عامر سہیل

چند باتیں

''انگارے'' کا پہلا سال مکمل ہوا، جنوری سے جاری ہونے والے ماہانہ کتابی سلسلے کی بارہویں کتاب آپ کے زیرِ مطالعہ ہے۔ میرے لیے یقیناً یہ خوشی کا مقام ہے کہ اِسے جاری کرتے ہوئے جن بنیادی محرکات اور مقاصد کو مدنظر رکھا گیا تھا، ان سے صرفِ نظر نہیں کیا گیا یعنی آزاد ادبی مکالمے اور گفتگو کی فضا کو تخلیق کرنا۔

یہ بات درست ہے کہ ادبی حوالے سے (اور زندگی کے حوالے سے بھی) ''انگارے'' اپنا واضح موقف رکھتا ہے اور ترقی پسندی اس کی شناخت حوالہ ہے تاہم دیگر نقطہ ہائے نظر رکھنے والے بھی یکساں احترام اور توجہ کے لائق ہیں اسی لیے ''انگارے'' نے ایک آزاد اور لبرل سوچ کو قائم کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہر مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والا مکمل آزادی کے ساتھ اس مکالمے میں شمولیت کر سکتا ہے۔ ''انگارے'' کے بارہ شمارے اس دعویٰ کا کھلا ثبوت ہیں۔ اس آزاد اور جمہوری رویے کو بعض احباب نے ناپسند بھی کیا اور نامعلوم خطوط موصول ہوئے جس میں ''سخت لہجے'' میں ''خبردار'' بھی کیا گیا تاہم اس ''تنبیہہ'' کے برعکس کوشش ہوگی کہ اس لبرل اور جمہوری رویے اور مکالمے کو مزید پروان چڑھایا جائے کیونکہ یہی ترقی پسندی کی اصلی روح ہے۔ اب توقع ہے کہ محترم قارئین اس سلسلے کو آگے بڑھائیں گے۔

گزشتہ دنوں ادیبوں، صحافیوں اور دانشوروں کے وفد نے اعلیٰ حکام سے ملاقات کی جس کے نتیجے کے طور پر جناب احمد ندیم قاسمی صاحب ایک مرتبہ بھی مجلس ترقی ادب کے ناظم مقرر ہو گئے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی صاحب نہایت قابلِ احترام شاعر، افسانہ نگار اور دانشور ہیں اور لوگوں نے ان پر اپنی محبتیں بھی نچھاور کی ہیں اور کیا ہی اچھا ہو کہ ہمارے ادیبوں، صحافیوں، شاعروں اور دانشوروں کے وفود اب اعلیٰ حکام سے اس لیے بھی ملیں اور ان پر زور دیں کہ خدارا مجلس ترقی ادب، انجمن ترقی اُردو، اُردو سائنس بورڈ وغیرہ ایسے اداروں پر بھی نظرِ کرم کی جائے کہ یہ ادارے ہی قوم و ملّت کی اصل شناخت ہوا کرتے ہیں۔ اُمید ہے کہ وفود کا یہ سلسلہ اداروں کے تحفظ اور ان کی حالت بہتر کرنے کے لیے بھی سرگرمِ عمل ہوگا۔

اور آخر میں ایک افسوس ناک خبر ___ کہ ملتان میں مقیم برصغیر پاک و ہند کے نامور مصور، دانشور اور شاعر جناب زوار حسین طویل علالت کے بعد ۲ر دسمبر کی صبح اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

ڈاکٹر انصار اللہ

پروفیسر گیان چند کے مقالے سے متعلق

ماہنامہ ''کتاب نما'' نئی دہلی کے اکتوبر ۱۹۹۸ء کے شمارے میں عالی جناب پروفیسر گیان چند صاحب کا مقالہ: ''خودنوشتہ دیوان غالب اور الزامِ جعل سازی'' ایک کرلفرما کی عنایت سے نظر نواز ہوا۔ یہ مقالہ اپنے موضوع سے کم اور میری ''ذات'' سے زیادہ متعلق ہے۔ اِس لیے عرض کرتا ہوں کہ اللہ کی زمین پر طرح طرح کی مخلوقات بستی ہیں۔ بعض وہ بھی ہیں جن پر دُھتکار اور مار کا بھی اثر نہیں ہوتا ہے۔ انسانوں میں بھی کچھ لوگ ایسے ہیں جو قانونی نوٹس پا کر ''اظہارِ افسوس'' کر دیتے اور پھر اپنی اصل کے مطابق مونچھوں پر تاؤ دے کر ویسی ہی حرکتوں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ زیرِ بحث مقالے میں پروفیسر گیان چند صاحب نے بڑے فخر سے یہ ذکر کیا ہے کہ

> ''تین سابق صدورِ شعبہ نے ایک وکیل کی معرفت مجھے ایک قانونی نوٹس بھیج دیا۔ رسالہ آج کل نے ادارے اور میری طرف سے اظہارِ افسوس رسالے میں شائع کر دیا۔ بات ختم ہوئی۔''

فائدہ یہ ہوا کہ پروفیسر گیان چند صاحب کسی بھی شخص کی توہین اور دلآزاری کرنے پر دلیر ہو گئے۔ اب وہ بات ختم کر دینے کا طریقہ سیکھ گئے تھے۔ زیرِ نظر مقالے میں بھی اُنہوں نے ایک ایسی ہی بات لکھی ہے جس پر وہ کیا جا سکتا ہے جو تین سابق صدورِ شعبہ نے کیا تھا لیکن حاصل اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ وہ پھر اظہارِ افسوس کر کے بڑے فخر سے کہتے پھریں گے کہ ''بات ختم ہوئی۔'' غیر تمندی ایک خداداد وصف ہے جو ہر شخص یا ہر ذات کے لوگوں کو میسر نہیں ہوا ہے۔

اِس مقالے میں موصوف نے اپنے پردادا کا ذکر کیا ہے۔ اُس کو پڑھ کر لطف آیا۔ افغانستان سے متعلق بعض مقولے یاد آئے۔ پروفیسر موصرف کے پردادا برسوں وہاں رہ کر اگر کسی لفظ کو اُس کے صحیح املا کے ساتھ نہ لکھ سکے تو اِس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ کابل میں بھی ہر قسم کی مخلوقات موجود ہیں۔ اُس شہر میں غلط نویسوں کے داخلے اور قیام پر کوئی پابندی نہیں ہے۔

پروفیسر گیان چند ایک خاص ماحول کے پروردہ ہیں۔ اُنہیں کیا معلوم کہ ہمارے معاشرے میں بچوں کو شروع سے ہی بڑوں کی تعظیم کرنے کی تعلیم دی جاتی ہے۔ میں نے خود کو ہمیشہ طالب علم ہی سمجھا ہے اور گیان چند صاحب ایک مدّت تک مدرسی کرتے رہے ہیں۔ میں نے احتراماً اُن کو اُستاد کہہ دیا۔ اِس پر وہ بہت چونکے چنانچہ لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر انصار اللہ کس رشتے سے میرے شاگرد بنتے ہیں مجھے علم نہیں۔''

غالباً اُن کا خیال ہے کہ اُن کا شاگرد بننا بھی کوئی بڑی عزت کی بات ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ جن لوگوں نے اُن کی تحریریں دیکھی ہیں وہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اُن سے سیکھنے والے کی لکھاوٹ کیسی ہوگی۔ میں نے جموں یونیورسٹی کے طالب علموں کی کاپیاں برسوں دیکھی ہیں۔ مستثنیات سے قطع نظر وہاں کے طالب علم مثنوی کو ''مشنوی'' ہی لکھتے ہیں۔ میرے بار بار لکھنے کے باوجود اِس کی تصحیح نہیں ہوسکی۔ اِسے استاد کا فیضِ جاریہ سمجھنا چاہیے۔

گیان چند صاحب سے پہلی بار میری ملاقات گورکھپور میں ہوئی تھی۔ وہ یونیورسٹی کے کسی کام سے تشریف لائے تھے اور ایک ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ میں ایم اے کا طالب علم تھا۔ اُن کی خدمت میں حاضر ہوا۔ لیٹے ہوئے تھے۔ پوچھا ''تمہارا کیا نام ہے؟'' میں نے نام بتایا تو حیرت کے مارے ایک دم بیٹھے ہوگئے اور بولے:

''تم انصار اللہ ہو؟ میں تو سمجھتا تھا کوئی ستر اسی برس کا بوڑھا ہوگا۔''

کچھ مدّت کے بعد گیان چند صاحب جموں میں پروفیسر ہو گئے۔ وہاں لکچرر کی جگہیں نکلیں۔ میں نے بھی درخواست دی۔ موصوف نے بڑی شفقت فرمائی۔ ہر طرح یقین دلایا کہ تمہارا تقرر ضرور ہوگا۔ یہ بھی فرمایا کہ

''صدرِ شعبہ کو نوٹ آف ڈِسنٹ لکھنے کا بھی اختیار ہوتا ہے۔''

یہ ہے وہ احسان جس کا میں نے ہمیشہ اور ہر طرح اعتراف کیا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اُس نے ایسے حالات پیدا کر دئے کہ میں انٹرویو کے لیے بھی جموں نہ جا سکا اور گیان چند صاحب کو میری موافقت میں ''نوٹ آف ڈِسنٹ'' نہ لکھنا پڑا۔ خدا نے بڑے احسان سے بچا لیا۔ میں نے مذکورہ ''ناکردہ احسان'' کے اعتراف کے طور پر گیان چند صاحب کو ''استاذی'' لکھنے اور کہنے کی غلطی کی تھی لیکن اب چونکہ اُن کو اعتراض ہے، آئندہ انشاءاللہ مجھ سے یہ قصور ہوگا۔

کہتے ہیں: ''مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید'' پروفیسر گیان چند صاحب نے اِس مثل کو گرہ میں باندھ رکھا ہے۔ زیرِ نظر مقالے میں بھی اُنہوں نے بہت باتیں ''در مدحِ خود'' لکھی ہیں۔ اُن کو مجھ سے ''شدید ردِ عمل'' کا شکوہ ہے اور وجہ اِس کی یہ فرماتے ہیں کہ اب وہ بقولِ خود ''اُترا شحنہ مردک نام'' ہیں۔ اُن کے موجودہ حالات اور حیثیت کے بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں ہے۔ مجھے اُن کے اُس زمانے کے کارناموں کا بھی علم نہیں ہے جب وہ بقولِ خود ''شحنہ'' تھے البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ میں نے کبھی اُن کا نام نامی کسی کلمۂ احترام کے بغیر نہیں لکھا۔ سہواً اگر کبھی ایسا ہو گیا ہو تو معذرت خواہ ہوں۔ میری طرف سے شدید تو کیا خفیف سے بھی ردِ عمل کا سوال نہیں تھا۔ میں تو اُن کا احترام ہی کرتا رہا ہوں۔ جس کا اِس مقالے میں بھی انہوں نے اعتراف کیا ہے۔ البتہ اُن کے ''عمل'' کی شدت کو اہلِ انصاف نے بارہا محسوس کیا ہے۔ دیوانِ غالب کے اُس نسخے سے متعلق جس کو گیان چند صاحب نے ''خود نوشتہ دیوانِ

غالب'' نام دیا ہے بحث کا آغاز کرتے ہوئے میں نے لکھا تھا کہ

''میری گزارش ہے کہ اِن امور پر غور کر لیا جائے۔''

اِس کے جواب میں جو کچھ لکھا گیا، اُس سے متاثر ہو کر پروفیسر عبدالقوی دسنوی نے ۲۲ مارچ ۱۹۷۱ء کے ہماری زبان میں لکھا تھا کہ

''جب تحقیق کرنے والوں کو سچائی کی تلاش کا حق ہے تو انہیں یہ حق بھی ملنا چاہیے کہ وہ اپنے نتائجِ فکر سے آگاہ بھی کریں۔ اُن کے خلاف کسی قسم کے ذاتی حملے دنیائے تحقیق کے لیے کسی طرح درست نہیں۔''

کہنے کو تو گیان چند صاحب بھی بہت سی اصولی باتیں کہتے ہیں لیکن وہ سب شاید دوسروں کے لیے ہوتی ہیں۔ خود اُن کا عمل ''شحنہ'' والا ہے اور یہ اِس لیے ہے کہ خود کو ''مردک'' کہلوانا نہیں چاہتے۔ اُن کی تحریروں کو پڑھ کر دسنوی صاحب کو ۱۵ ستمبر ۱۹۷۱ء کے ہماری زبان میں دوسری بار یہ لکھنا پڑا کہ

''میری گزارش ہے کہ کسی فیصلے کے سنانے میں عجلت نہ کی جائے اور نہ ہی تحقیق کام کرنے والوں کو لعن طعن کا شکار بنایا جائے۔ تحقیق کرنے والوں کی طرف سے تحقیق کرنے والوں کے لیے تحقیر کے الفاظ زیب نہیں دیتے اور نہ ہی یہ دور ایسا ہے کہ اُن کے خلاف محاذ بنایا جائے۔''

لیکن اِن باتوں پر کون کان دھرتا ہے۔

کون نہیں جانتا کہ کتاب میں شامل ہر مضمون ہر زمانے میں پڑھا اور پرکھا جائے گا۔ کوئی مصنف اِس عمل پر پابندی عائد نہیں کر سکتا۔ پروفیسر گیان چند صاحب ''بیاض غالب تحقیقی جائزہ کا تحقیقی جائزہ'' کے موضوع یا مضمون کو ''مُردہ گھوڑا'' قرار دیتے ہیں اور اِس سے متعلق بحث کو ''تضیعِ اوقات'' بتاتے ہیں۔ اِس کے باوجود اِس مضمون کو رسالے میں چھپوانے کے بعد انہوں نے اِس کو اپنی کتاب میں بھی شامل کیا۔ کیا اِس عمل سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ وہ اپنے مردہ گھوڑے کو یادگار بنا کر ہمیشہ کے لیے تضیعِ اوقات کا سامان کر رہے تھے؟ پروفیسر گیان چند صاحب کا علم و دانش کی خدمت کا یہ انداز بھی خوب ہے۔

پروفیسر گیان چند صاحب تحقیق کا دم بھرتے ہیں اور حال یہ ہے کہ اپنے گریبان میں منہ ڈال کر نہیں دیکھ سکتے۔ اپنے منہ میاں مٹھو بن کر موصوف فرماتے ہیں:

''میں علمی معاملات میں اختلاف کو ذاتی تعلقات سے الگ خانے میں رکھتا ہوں۔۔۔ مادر پدر پیرِ نابالغ کو بھی زیب نہیں دیتا۔''

چہ خوش۔ یہ دعوا آپ ہی کے منہ پر پھبتا ہے۔ زیرِ نظر مقالے میں بھی علمی دلائل تو آپ سے پیش نہ کیے گئے۔ گالی گلوچ پر اُتر آئے۔ ایک سے زائد بار مجھے ''جولاہہ'' فرمایا۔ آپ کے کہنے سے یہ

واقعی جولاہہ تو ہو نہیں گیا البتہ آپ کی ذات پہچان لی گئی۔ سچ یہ ہے کہ پروفیسر گیان چند صاحب کو نہ زبان پر قابو ہے، نہ اپنے قلم پر اور نہ ہمت و حوصلہ۔ لکھنے کو تو آپ نے مجھے جولاہہ لکھ دیا لیکن پھر ڈر کر بات کو لیپنے پوتنے کی کوششوں میں لگ گئے اور کبیر کی خوبیوں کا ذکر لے بیٹھے۔

میرے لیے اپنی طرف سے کوئی ''ذات'' تجویز کر لینے سے پہلے اِس اصول پرست نے اپنی اصل کی طرف خیال نہیں کیا۔ پروفیسر حکم چند نیّر نے مجھ سے بیان کیا تھا کہ ایک طالب علم اِن سے متعلق ریسرچ کر رہا تھا۔ موصوف کو خیال ہوا کہ وہ اِن کے حسب نسب کی تحقیق کے لیے اِن کے وطن اصلی کی طرف بھی جائے گا۔ ڈرے اور اپنے تمام اعزا کو تاکیدی خط لکھے کہ اِس طالب علم سے کوئی بھی بات نہ کرے۔ گیان چند صاحب پروفیسری سے ریٹائر ہو کر امریکہ سدھار گئے۔ اب انہیں پورا موقع ہے جسے چاہیں اپنا پردادا، لکڑدادا بنا کر اُس کے بارے میں جو چاہیں لکھیں اور جس طرح چاہیں اپنے نسب پر فخر کریں۔

دوسروں کے لیے دل آزار اور ''بے پَر کی'' اڑاتے رہنا بھی گیان چند صاحب کی سرشت میں داخل معلوم ہوتا ہے۔ جن دنوں یہ حیدرآباد میں صدر شعبہ تھے۔ میری ایک شاگرد وہاں حفیظ دہلوی کا دیوان دیکھنے گئی۔ میں نے پروفیسر موصوف کو خط لکھا کہ ''یہ میری نگرانی میں ریسرچ کر رہی ہیں اور دیوانِ حفیظ دیکھیں گی۔'' حضرت کی طبیعت نے جو گل کھلایا اُس کی داد دینی چاہیے۔ میرے جملوں کے حوالے سے لکھا:

''یہ شاید آپ کی بیگم ہیں۔''

ہمارے معاشرے میں شاگرد اولاد کے درجے میں ہوتا ہے اور ریسرچ اسکالر کو لائقِ احترام خیال کیا جاتا ہے لیکن پروفیسر گیان چند دوسری دنیا کے لوگ ہیں۔ اُن کی ذاتِ والا صفات شاید اپنی اولاد کو بیگم ہی خیال کرتی ہے۔ دوسروں کے معاملات کو بھی وہ اپنی ہی نظر سے دیکھنا چاہتے ہیں۔

پروفیسر حکیم چند نیّر کہا کرتے تھے کہ کسی کے خلاف کوئی مبتذل بات مشہور کرنا چاہو تو گیان چند صاحب سے ذکر کر دو۔ وہ زبان اور قلم سے اُس کا ڈھنڈھورا پیٹتے پھریں گے۔ گیان چند صاحب کو اُن باتوں کا بھی علم ہو جاتا ہے جو تا حال وقوع پذیر نہیں ہوئیں۔ جن دنوں میں لکچرر تھا، میرا حیدرآباد جانا ہوا۔ ایک جلسے میں تقریر فرماتے ہوئے موصوف نے مجھے ریڈر کہا۔ میں ان کی باتوں کو ہمیشہ انگیز کر لیتا ہوں لیکن یہ چونکہ غلط فہمی کا سبب بن سکتی تھی مجھے وہیں اِس بیان کی تردید کرنی پڑی۔ خالص علمی مباحث کی طرف بھی موصوف کا رویہ یہی ہے۔ مثال کے طور پر اپنی ضخیم کتاب ''اردو مثنوی شمالی ہند میں'' میں تذکرہ گلستانِ بیخزاں عرف نغمۂ عندلیب کے بارے میں فرماتے ہیں کہ

''مشہور ہے کہ یہ تذکرہ مولانا امام بخش صہبائی کی تصنیف ہے۔'' (صفحہ ۴۰۷)

یہ تو نہیں معلوم کہ یہ مشہور بات پروفیسر گیان چند نے کس سے سنی البتہ یہ تقریباً یقینی امر ہے

کہ کسی دوسرے سے یہ مشہور بات شاید کسی نے بھی نہ سنی ہوگی۔

پروفیسر گیان چند صاحب فرماتے ہیں کہ ''میں بہر حال آزادیِ اظہار میں یقین رکھتا ہوں'' اور اِسی لیے وہ دانستہ اور نادانستہ دوسروں کی دلآزاری کرتے رہتے ہیں۔ میرا کہنا ہے کہ بغیر سند اور حوالے کے کسی کو بھی کچھ کہہ دینے کا حق بہر حال نہیں دیا جا سکتا۔ اردو معاشرے نے بلاشبہ بہت کچھ کیا ہے لیکن ایسے لوگ بھی ہیں جن کا یہ معاشرہ کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتا۔ کابل میں برسوں رہنے سے کیا ہوتا ہے؟

اُسی مبینہ ''خود نوشتہ دیوانِ غالب'' سے متعلق بحث کے دوران ایک مراسلہ چھپا جس میں مجھ سے کوئی بات پوچھی گئی تھی۔ ''آزادیِ اظہار میں یقین رکھنے والے'' نے پھبتی کسی کہ مراسلہ نویس انصار اللہ کی اولادِ معنوی معلوم ہوتا ہے۔ دوسرے کی اولادِ معنوی کو فی الفور شناخت کر لینے والے پر حیرت ہے کہ میرے واضح اشاروں کے باوجود وہ خود اپنی اولادِ معنوی کو شناخت نہیں کر رہا ہے۔ ناچار اُس کا حال وضاحت سے لکھتا ہوں۔

میں نے پروفیسر نثار احمد فاروقی کے مرتب کردہ کلیات مصحفی پر سہ ماہی اردو ادب میں تبصرہ لکھا تھا۔ اُس میں جناب مالک رام سے شاگردانہ یہ معلوم کیا تھا کہ کسی مخطوطے کو دیکھے بغیر یہ فیصلہ کس طرح کیا جا سکتا ہے کہ وہ اہم نہیں ہے۔ یہ بات پروفیسر گیان چند صاحب کو بہت ناگوار گذری۔ اُنہوں نے اِس کو میری گستاخیوں میں شمار کیا۔ اِس کے بعد رسالہ ''آگہی'' میں اِس سلسلے میں وہ مضمون چھپا جس میں مجھے کچل دئے جانے کی بات کہی گئی تھی۔ اِس پر مضمون نگار کی حیثیت سے نام ''محمد عمر'' چھپا تھا۔ میں اِس محمد عمر سے بالکل ناواقف ہوں۔ معلوم نہیں کہ اب پروفیسر گیان چند صاحب اس کا تعارف کرانا پسند کریں گے یا نہیں۔

میں نے اپنے اُس مضمون میں جو کتاب نما کے فروری ۱۹۹۸ء کے شمارے میں چھپا تھا اور جس کی پاداش میں پروفیسر گیان چند مجھے ''جولاہہ'' وغیرہ بکھاننے لگے یہ بھی عرض کیا تھا کہ

> ''میں اِس واقعہ کو بھی نہیں بھول سکتا کہ بیاضِ غالب سے متعلق بحث چھیڑ دینے کے جرم میں اِس بات کی بھی کوشش کی گئی کہ مجھے ملازمت سے برطرف کر دیا جائے۔''

اب سے کوئی سترہ اٹھارہ برس پہلے میں نے یہ لکھا تھا کہ ''ایک متدین پدم شری'' نے یہ کوشش کی تھی۔ پروفیسر گیان چند کو وہ بات اب یاد آئی اور اب انہوں نے اُس کے نام کے بارے میں قیاس آرائی کر کے دو نام پیش کیے:

پہلا پروفیسر نذیر احمد کا اور دوسرا پروفیسر قاضی عبدالستار کا

جس زمانے کا یہ قصہ ہے قاضی عبدالستار صاحب پدم شری نہیں ہوئے تھے۔ اُن کو متدین بھی نہیں کہا جا سکتا ہے۔ نذیر احمد صاحب کے معاملات سرور صاحب کے ساتھ خوشگوار نہیں تھے اِس لیے وہ

کوئی سفارش خصوصاً منفی سفارش نہیں کر سکتے تھے۔ان دونوں حضرات کا ''نسخہ عرشی زادہ'' سے کوئی تعلق نہیں تھا۔گیان چند صاحب محقق ہونے کے باوجود اگر واقعی غور وفکر کے بعد اِن حضرات کے بارے میں وہ خیال کرتے ہیں تو یہ افسوس ناک بات ہے کیونکہ اِس قیاس کے لیے کم از کم میرے نزدیک کوئی قرینہ موجود نہیں ہے۔

ایک سوال یہ بھی ہے کہ اِتنی مدت کے بعد پروفیسر گیان چند صاحب کو نام کی جستجو کیوں ہوئی؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ حقیقتِ حال کا انہیں علم ہو اور وہ اِس حقیقت سے قارئین کی توجہ ہٹانا چاہتے ہوں؟ میں نے اتنی مدت تک جس نام کو ظاہر نہیں کیا تھا، آج اُس کا ذکر کرتا ہوں۔ ہوا یہ کہ جس زمانے میں بقول پروفیسر گیان چند صاحب ''خود نوشتہ دیوانِ غالب'' سے متعلق میری تحریریں چھپنی شروع ہوئیں، ایک دن میں پروفیسر آل احمد سرور صاحب صدر شعبہ اردو کے کمرے میں گیا۔سرور صاحب کے سامنے میز پر ایک کھلا ہوا لفافہ رکھا تھا اور خط اُن کے ہاتھ میں تھا۔سرور صاحب نے مجھے دیکھ کر فرمایا: ''آج مجھے بہت رنج ہوا''۔ میں خاموش لیکن فکرمندی کے انداز سے متوجہ ہوا تو انہوں نے مزید فرمایا: ''میرے عرشی صاحب سے بہت اچھے مراسم ہیں۔''

اِن دونوں بیانوں کا ربط میری سمجھ میں نہ آ سکا اِس لیے میں حیرت سے اُن کی طرف دیکھتا رہا۔سرور صاحب نے بتایا کہ نسخۂ عرشی زادہ سے متعلق آپ جو لکھ رہے ہیں، یہ خط اُس سے متعلق ہے۔ مجھ سے پوچھا گیا ہے کہ آپ کو شعبہ سے اب تک کیوں نکالا نہیں گیا؟ میرے دل پر جو گذر گئی ہوگی، اُس کا صرف قیاس کیا جا سکتا ہے۔ میں نے سر جھکا کر آہستہ سے پوچھا: میرے لیے کیا حکم ہے؟''

فرمایا: ''آپ فکرمند نہ ہوں۔ لکھتے پڑھتے رہیے۔ میں نے صرف آپ کو آگاہ کیا ہے کہ دنیا میں ایسا بھی ہوتا ہے۔'' اِس دلدوز علمی سانحہ کے بعد ۱۵ اکتوبر ۱۹۷۰ء کے ہماری زبان میں میرا جو مضمون چھپا ہے اُس میں یہ جملے اِسی کے ردِعمل کے طور پر بے اختیار قلم سے نکل پڑے تھے:

> ''جن بزرگوں اور دوستوں نے مخدوم مکرم پروفیسر آل احمد سرور کی خدمت میں خطوط لکھے۔۔۔کتابوں کے انبار میں رہ کر ایک عمر صرف کر دینا قابلِ ذکر بات سہی کہ اس سے کبھی کبھی دوسروں کے لیے عزت کا ساماں ہوتا ہے لیکن محض اتنی بات سے کوئی شخص دانشمند یا محقق نہیں ہو جاتا۔۔تحقیق کے لیے لازم ہے کہ موضوع پر تمام تعصّبات سے بالاتر ہو کر خواہ وہ وطنیت کے ہوں، ولدیت (نسب) کے ہوں یا ملکیت کے، غور وفکر کیا جائے۔''

یہ ہیں پروفیسر گیان چند کے عرشی صاحب، جو اَب خدا کو پیارے ہو چکے ہیں۔اللہ کا شکر ہے کہ پروفیسر سرور صاحب ابھی بقیدِ حیات ہیں لیکن اب وہ اِس واقعہ کی تصدیق کرنا پسند کریں گے یا نہیں، میرے لیے کچھ کہنا ممکن نہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میرے مضامین سے خود سرور صاحب کو بھی نقصان

ہوئے ہیں لیکن وہ عالی ظرف ہیں۔کبھی خود انہوں نے اِس کا اظہار نہیں کیا۔ میں نے دوسروں سے سنا، رنج ہوا اور نتیجہ کے طور پر میں نے ہماری زبان میں لکھنا چھوڑ دیا تھا۔آزادیِ اظہار کے دعوے کرنے والے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھیں۔ظلم وزیادتی کی بہت سی داستانیں یاد آ جائیں گی۔ بات ختم کرنے سے پہلے پروفیسر گیان چند سے ایک بار پھر یہ کہتا ہوں کہ کسی کو پچل کر، یا جولاہہ کہہ کر وقتی طور پر زبان بندی کی جا سکتی ہے لیکن حقیقت آج نہیں تو کل، کل نہیں تو پرسوں، آپ کی زندگی میں نہیں تو آپ کے بعد بہرحال ظاہر ہو کر رہے گی۔'' خود نوشتہ دیوانِ غالب کے بارے میں پروفیسر گیان چند صاحب نے ۱۵ جولائی ۱۹۷۱ء کے ہماری زبان میں لکھا تھا:

> ''اس نسخے کی بحث میں زیادہ تر زور اس نکتے پر صرف ہوا ہے کہ یہ غالب کے ہاتھ کی تحریر ہے کہ نہیں میرے نزدیک یہ پہلو اتنا زیادہ اہم نہیں جتنا ذیل کے دو پہلو۔''

یہ محض کہنے کی بات ہے۔ میرا کہنا صرف یہ ہے کہ نسخہ بخطِ غالب نہیں ہے۔اگر یہ پہلو اتنا اہم نہیں ہے تو آپ کو میرے لیے کوئی ''ذات'' تجویز کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی اور آپ علمی انداز سے گفتگو کیوں نہیں کر سکتے؟ پروفیسر نذیر احمد اور پروفیسر قاضی عبدالستار کے ناموں کو بغیر کسی قرینے کے آپ نے کس لیے گھسیٹا؟ آپ کے اس عمل کے لیے کون سا لفظ استعمال کیا جائے گا؟

☆☆☆

ڈاکٹر انور سدید

کچھ وقت ڈاکٹر اعجاز راہی کے ساتھ

ڈاکٹر اعجاز راہی کا شمار آزادی کے بعد راولپنڈی اسلام آباد کے ادبی افق سے ابھرنے والے ایسے ادیبوں میں ہوتا ہے۔ جنہوں نے شہرت کا تعاقب نہیں کیا اور اپنی ساری توجہ تصنیف و تالیف، کتاب دوستی، مطالعے اور دانایانِ عصر حاضر کے علاوہ راہنمایانِ عالم کے خیالات، افکار اور نظریات کے ساتھ مجادلے میں گزاری۔ وہ بنیادی طور پر حزبِ اختلاف کے آدمی تھے۔ دوستوں کے حلقے میں اونچی آواز سے بات کرتے لیکن انہیں مرعوب کرنے کی بجائے دلیل سے قائل کرنے کی کوشش کرتے اور جب اُن کے دوست جن میں سے بیشتر حلقہ اربابِ ذوق راولپنڈی کے رکن یا نئے لکھنے والوں کی انجمن کے ساتھیوں میں شمار ہوتے تھے، ان کی رائے کا ساتھ نہ دیتے اور اُنہیں اکیلا چھوڑ دیتے تو اعجاز راہی مایوس نہ ہوتے بلکہ اگلے جلسے میں دلائل کے نئے ہتھیاروں سے لیس ہو کر آتے۔ رزم کی بجائے بزم کی فضا پیدا کرتے اور جب حسبِ سابق محفل منتشر ہوتی تو اُن کے ہاتھ میں صرف ان کا اپنا پرچم ہوتا۔

اعجاز راہی راولپنڈی کے اس گروپ کے معاون تھے جس نے پرانے لکھنے والوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور حلقہ اربابِ ذوق کے مقابلے میں نئے لکھنے والوں کی انجمن بنائی۔ اس پلیٹ فارم سے جو لوگ معروف ہوئے ان میں رشید امجد، رشید نثار، نثار ناسک، سرور کامران، ربیعہ فخری، ادیب سہیل، ماجد الباقری، شبنم منا روی، سید باقر علیم اور متعدد دوسرے نوجوان شامل تھے جن کے ادب کی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ ادھر لاہور میں ناصر کاظمی اور انتظار حسین نے نئی نسل کا پرچم بلند کر رکھا تھا۔ افتخار جالب نے انیس ناگی، جیلانی کامران، سلیم الرحمان، زاہد ڈار، عباس اطہر اور متعدد معاونین کے ساتھ نئے اظہار کے لیے نئی راہیں تلاش کرنے کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ میرا اندازہ ہے کہ پنڈی کے ادیب بھی ان تحریکوں سے متاثر تھے لیکن انہوں نے اپنا پرچم بلند کیا تو ڈاکٹر وزیر آغا کی قیادت کو قبول کیا جن کی کتاب ''اردو شاعری کا مزاج'' نے اس دور میں ہنگامہ برپا کر رکھا تھا اور رسالہ ''اوراق'' نے جدیدیت کے پرچم تلے بیشتر نئے لکھنے والوں کو جمع کر لیا تھا۔ چنانچہ پنڈی کے اس نئے گروپ نے جس کا ایک تابندہ ستارہ اعجاز راہی بھی تھا ''اوراق'' اور وزیر آغا کے ساتھ وابستگی اختیار کی۔ اس لحاظ سے یہ گروپ مولانا صلاح الدین احمد کے نظریہ ادب کی توسیع بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ پنڈی کے نئے لکھنے والے ادب میں اپنی شرائط پر آئے تھے اور ان سب نے اپنے داخل کی آواز کو ادب کے مختلف وسیلوں سے پیش کرنے کی سعی کی رشید امجد، شمس نعمان، احمد جاوید، سمیع آہوجہ اور منشایاد افسانے میں معروف ہوئے۔ ان سب نے اِس دور میں علامتی اور تجریدی

افسانے کو فروغ دیا۔ ان میں ڈاکٹر اعجاز راہی بھی ایک اہم نام تھا جس کے افسانوں کی پہلی کتاب ''تیسری ہجرت'' چھپی تو ان کی انفرادیت کو نہ صرف تسلیم کر لیا گیا بلکہ ان کو جدید افسانے کا ایک اہم فرد بھی شمار کیا گیا اور بھارت کے افسانہ نگار جوگندر پال نے انہیں ایک خط میں لکھا۔

> ''تمہاری سچائی، انہماک، بے چینی کی توانائی اور زندگی کو جھیل جھیل کر اس سے لطف اندوز ہونے کی خو نے مجھے بڑا متاثر کیا۔ غالباً یہی وہ عناصر ہیں جن کی بدولت فنکار کا تخلیقی اظہار اس سطح تک پہنچ پاتا ہے جہاں پانی بہت ڈونگھا (گہرا) ہو اور جہاز رانی آسان۔''

دلچسپ بات یہ ہے کہ اعجاز راہی نے ہمیشہ گہرے پانیوں میں سفر کیا۔ یہ گہرے پانی اسے زندگی میں بھی پیش آئے اور ادب کی دنیا میں بھی۔ زندگی میں انہوں نے ابتداً اسلام آباد کی ایک معمولی ملازمت سے کی۔ پھر پی آئی اے میں نوکری ملی لیکن اس کاروباری اور درباری ادارے کو اعجاز راہی کی کجکلاہی پسند نہ آئی اور فوجی حکومت مخالف سرگرمیوں کی وجہ سے انہیں ملازمت بدر کر دیا گیا۔ اعجاز راہی نے مفلسی کا یہ دور خودی اور خودداری سے بسر کیا اور ''مقتدرہ قومی زبان'' میں نوکری اختیار کر لی جس کے تجربات کا حاصل ان کا ناول ''معتوب'' ہے۔ تاہم اس عرصے میں انہوں نے افسانے کے ساتھ ساتھ اپنے اظہار کے لیے شاعری کا راستہ بھی اختیار کیا اور شاعری کا مجموعہ ''بے برکت دعائیں'' کے نام سے پیش کیا جو ردِعمل کی تند و تیز لہروں کو اُبھارتا اور فکر کے دریا کے کناروں کو کاٹتا چلا جاتا ہے۔ اس دور میں ہی اعجاز راہی کو اپنی رائے کا اظہار کھلے طور پر کرنے کی جرأت عطا کی جو ان کے مطالعے سے پیدا ہوئی، اس جرأت نے تنقید کا زاویہ اختیار کیا۔

افسانہ چونکہ اعجاز راہی کی پہلی محبت تھی اس لیے انہوں نے افسانے کی تنقید پر زیادہ توجہ دی۔ اس دور میں علامت نگاری اور تجرید کے خلاف ایک روچل پڑی تھی۔ اعجاز راہی نے اس کے خلاف اپنی آواز یوں اٹھائی کہ اس کے فنی علائم کے تمام گوشوں پر نظر ڈالنے کے لیے اسے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے کا موضوع بنا لیا۔ ''اظہار'' ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جس کا مطالعہ لکھنے والوں کو نئے راستے دکھاتا ہے۔

یہ تفصیل یہاں اس لیے پیش کی گئی ہے کہ اگلے روز مجھے اعجاز راہی کا ایک ایسا خط ملا جس نے میرے باطن کو لرزہ براندام کر دیا۔ میرے ذہن میں اعجاز راہی کی وہی تصویر تھی جو میں نے ۱۹۷۰ء کی دہائی میں مرتب کی تھی۔ بعد کی ملاقاتوں میں بھی وہ مجھے ہمیشہ توانا اور صحت مند نظر آئے۔ اب کچھ عرصے کے بعد ان کا خط ملا تو لکھا تھا۔

> ''پچھلے دنوں کچھ بیمار ہو گیا تھا۔ بیماری بھی موذی تھی ہیپاٹائٹس سی۔۔۔ چنانچہ اس کے خوف کے تحت جلدی جلدی کتابیں چھاپ لیں۔ غلطیاں بھی رہ گئیں

مگر جی چاہتا تھا کہ یہ سب طباعت میں آ جائیں۔''

اس خط کے ساتھ چار کتابیں تھیں۔ ان میں سے ایک کا عنوان 'اردو افسانے میں علامت نگاری' ہے جو اعجاز راہی کا طویل ترین فکر انگیز مقالہ ہے۔ اس مقالے پر انہیں سندھ یونیورسٹی نے پی ایچ ڈی کی ڈگری دی تھی اور یہ ڈاکٹر نجم الاسلام کی نگرانی میں لکھا گیا تھا دوسری کتاب ''شام ڈھلے'' ان کا ایک ناول ہے اور اس میں معاشرے کے اس جبر کو عیاں کرنے کی سعی کی گئی ہے جس کا شکار آج کا ہر سوچنے والا فرد ہے۔ تیسری کتاب ''اردو افسانے میں اسلوب کا آہنگ'' ہے۔ میں اسے ان کی پی ایچ ڈی کے مقالے کی توسیع اور علامتی و تجریدی افسانے کی طرف داری کا نقش تصور کرتا ہوں۔ اس کے سب مضامین ادیبوں اور نقادوں کے اٹھائے ہوئے سوالات کے جوابات میں لکھے گئے ہیں اور اپنے جلو میں نئے افسانہ نگاروں کی وہ نئی حقیقتیں بھی آشکار کرتے ہیں جنہیں صرف اعجاز راہی کی تنقیدی نظر دیکھ سکتی تھی۔ چوتھی کتاب ''ویو پوائنٹ'' اعجاز راہی کے کالموں کا مجموعہ ہے اور اس میں وہ معاشرتی ردِعمل سامنے آتا ہے جو نہ نظم میں ڈھل سکتا ہے اور نہ افسانے کا روپ اختیار کر سکتا ہے۔ اس کتاب میں اعجاز راہی نے معاشرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا ہے اور اس کتاب کے آئینے میں معاشرے کا داغدار چہرہ منعکس کیا ہے۔

میں اعجاز راہی کا شاید قدیم ترین شناسا ہوں لیکن یہ اعتراف بھی ضروری ہے کہ ان سے میری ملاقاتیں بے حد محدود ہیں اس مرتبہ ان کتابوں میں مجھے ان سے پوری طرح متعارف ہونے کا موقعہ ڈاکٹر ظہور اعوان نے دیا جن کا ایک خاکہ ان کی زندگی کے داخلی اور خارجی گوشوں کی پوری عکاسی کرتا اور اعجاز راہی کی زندگی اور ادب میں مشقت کو آشکار کرتا ہے۔ اس خاکے میں اعجاز راہی افسانے کی دنیا کے افسانوی آدمی ہی نظر آتے ہیں۔ ان کی تین کتابوں پر جو پورٹریٹ چھپے ہیں وہ ظاہر کرتے ہیں کہ اس کڑیل پٹھان کے جسم و جان پر وقت حملہ آور نہیں ہو سکتا۔ حالانکہ وقت ہمیشہ ان پر حملہ آور رہا۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ وقت اعجاز راہی کو پسپا نہیں کر سکا۔ لیکن ان کی چوتھی کتاب کی پشت پر جو تصویر ہے اس نے مجھے خوفزدہ کر دیا ہے۔ ان کا خط بھی مجھے اندر کے آلام سے باخبر کر رہا ہے اور اعجاز راہی کو اپنی کتابیں چھاپنے کی جلدی ہے تو ان کی عجلت کا مفہوم بھی میں سمجھ سکتا ہوں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اعجاز راہی پیپا ٹائٹس سی قسم کے مرض پر قابو پا لیں گے اور وہ حسبِ سابق زمانی حقیقتوں کو اپنے جراحت نگار قلم سے معاشرے کے سامنے پیش کرتے رہیں گے۔ میں اعجاز راہی کی لمبی اور صحت مند عمر کے لیے دعا کر رہا ہوں اور ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے مجھے اپنی معیت میں چند لمحات گزارنے کا موقع دیا۔ ڈاکٹر اعجاز راہی میں آپ کا ممنون ہوں۔

☆☆☆

رفعت سروش

حرفِ زیرِ لب ___ ایک جائزہ

اُردو میں ترقی پسند تحریک کی بنیاد تو اسی وقت پڑ چکی تھی جب ۱۸۷۴ء میں آزاد، حالی اور اُن کے رفقا نے نیچرل شاعری کے عنوان سے نئی نظمیں کہیں اور اُردو شاعری کو غزل کے تنکنائے سے نکالا۔ بیسویں صدی میں یہ تحریک اقبال، چکسبت، جوش اور اُن کے ہم نواؤں کے حوالوں سے نئی وسعتوں سے ہمکنار ہوتی رہی اور ہندوستان کی جنگ آزادی اور ملکی مسائل کو بالخصوص موضوعِ سخن بنایا۔ اس تحریک کو تنظیم کی صورت ۱۹۳۶ء میں جب سجاد ظہیر، ڈاکٹر رشید جہاں، فیض احمد فیض اور اس وقت کے دیگر مقتدر اکابرین ادب نے ایک متوازن منشور پر دستخط کیے اور ادب کو بین الاقوامی طور پر رونما ہونے والی تبدیلیوں اور دنیا بھر میں آزادی کی لہر کو اپنے اندر جذب کرنے کی تحریک سے ہمکنار کیا۔ ترقی پسند مصنفین کی تحریک نے تیزی سے مقبولیت حاصل کی اور برصغیر میں ربع صدی تک یہ تحریک عروج پر رہی، پھر تنظیمی ڈھانچے کی چولیں ڈھیلی ہونے لگیں اور کچھ لوگ مارآستیں بن کر ظاہر ہوئے اور کچھ نے شب خوں مارا اور بظاہر یہ شیرازہ بکھرتا نظر آنے لگا۔ مگر بکھری تو تنظیم، وہ خیالات اور نظریات جو اس ملک میں ایک صدی سے پروان چڑھ رہے تھے، یک لخت کیسے مفقود ہو سکتے تھے۔ ترقی پسند تحریک نے اردو ادب کو ادیبوں اور شاعروں کو جو کہکشاں دی ہے اس کا جواب تو شاید ایک صدی میں تو نہیں پیدا ہو سکتا۔

سجاد ظہیر، ڈاکٹر عبدالعلیم، احتشام حسین اور آل احمد سرور، کرشن چندر بیدی، عصمت، منٹو، احمد ندیم قاسمی، فیض، سردار جعفری، مجاز، جذبی، ساحر، جاں نثار اختر، اختر الایمان، کیفی اعظمی، مخدوم محی الدین، حمایت علی شاعر جس دور میں یہ سب آفتاب و ماہتاب، ایک ساتھ آسمانِ ادب پر جگمگا رہے ہوں اس کا جواب کیا کوئی تاریخ دے سکتی ہے۔

۱۹۶۰ء کے بعد جدیدیت نے پر و بال کھولے۔ پھر مابعد جدیدیت کی بات چلی کیا کوئی نیا ستارہ اس ترقی پسند کہکشاں کے کسی ستارے کو ماند کر سکا۔ نہیں، نہیں ترقی پسند مصنفین کی تحریک نے دراصل جو اہم کام کیا ہے وہ ہے ادیبوں اور شاعروں میں تخلیقی شعور پیدا کرنا۔ لفظ کو بنی نوع انسان کی فلاح اور اس میں شعورِ جمالیات پیدا کرنے کے لیے استعمال کرنا اور برصغیر میں طویل عرصۂ غلامی کے باعث لوگوں میں احساس کمتری کو ختم کرنا، یاسیت کے بھنور سے نکالنا اور جہد و عمل کا جذبہ بیدار کر کے مزاجوں میں رجائیت پیدا کرنا۔ یہی وجہ ہے کہ تنظیمی ڈھانچے کے کمزور پڑ جانے کے بعد بھی ترقی پسند تحریک کے پروردہ ادیب اور شاعر ایک مثبت رویہ رکھتے ہیں اور زندگی ___ بہتر زندگی کے لیے جدوجہد کرنا ان کے مزاج کا حصہ بن چکا ہے۔

نکہت بریلوی نے ترقی پسند تحریک کے سایہ دار درخت کے سائے میں آنکھ کھولی، اور ہر چند

کہ وہ تنظیمی ڈھانچے سے دور رہے مگر ان کے خیالات سراسر ترقی پسند تحریک کی دین ہے اور میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ جن لوگوں نے ترقی پسندی کے امرت کو پیا ہے وہ اگر چاہیں بھی تو اپنے بنیادی رویے سے منحرف نہیں ہو سکتے۔ مثالیں سامنے ہیں کہ کچھ لوگوں نے بعض ترقی پسند رہنماؤں کی کٹھ ملائیت سے تنگ آ کر اعلانِ بغاوت کیا، مگر کیا ان کا ادب ترقی پسندی کی بنیادی اقدار سے دور ہو سکا۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کی شاعری کو اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ جو باغی ترقی پسند تھے یہ تو ایک نام ہے۔ میں اور کوئی ایسے نام گنوا سکتا ہوں، مگر طوالت کے خیال سے اس قصے کو مختصر کرتا ہوں۔

نکہت بریلوی نے اس وقت شعر کہنا شروع کیا جب ترقی پسند صفوں میں غزل مخالف آوازیں اٹھنا بند ہو گئی تھیں اور مجروحؔ اور فیضؔ کی غزل نے بساط الٹ دی تھی۔ یہ دو نام استعارے کے طور پر ہیں ورنہ ان کے کئی ہمنوا اس تیزی سے غزل کے میدان میں اترے کہ وقت نے طے کر دیا کہ ''ترقی پسند غزل'' کی الگ پہچان ہے، اس کے محاورے، الفاظ، تراکیب، تشبیہہ، استعارے، پرانی غزل سے اسے ممیز کرتے ہیں، نکہت بریلوی کی غزل بلاشبہ ترقی پسند غزل کے زمرے میں آتی ہے اور اس حوالے سے وہ جذبیؔ، فیضؔ اور مجروحؔ کی وراثت کے حامل کہے جا سکتے ہیں۔ ہر چند کہ پاکستان میں ابن انشاؔ اور ناصر کاظمی کی غزل کا افق بالکل دوسرا ہے اور بہت تابناک ہے، مگر نکہت کو اس رجحان سے کوئی تعلق نہیں۔ ان کی شاعری روایت کا تسلسل ہے۔

مجروحؔ کو تو انہوں نے اپنے ایک شعر میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے

کیا کریں نکہتؔ کہ ہم مجروحؔ صاحب کی طرح
کچھ بہ انداز غزل بھی سرفروشانہ کہیں

دونوں پیشہ شروع میں طبابت تھا، پھر ترک کر دیا۔ مجروحؔ فلم کے ہو رہے اور نکہت ادب و صحافت کے۔ اس رعائت سے یہ شعر اور لطف دے رہا ہے۔

نکہتؔ بریلوی کے نام سے تو راقم الحروف ''افکار'' کے حوالے سے ایک عرصہ سے واقف تھا، لیکن ان سے باقاعدہ تعارف اپنے پرانے دوستوں خلیق ابراہیم خلیق اور حمایت علی شاعرؔ کے مضامین سے حاصل ہوا۔ حمایت تو واقعی شکریئے کے مستحق ہیں کہ انہوں نے نکہت صاحب کے کلام کو جگہ جگہ سے چن کر ایک گلدستہ ترتیب دیا اور کتاب کا خوبصورت نام بھی دیا ''حرفِ زیرِ لب''۔ غزل نظم کی طرح واویلا نہیں مچاتی، گرجتی برستی نہیں، نہایت متانت اور لطافت سے زیرِ لب باتیں کرتی ہے۔ اس لیے غزل فہمی بھی ہر کسی کے حصہ میں نہیں آتی۔ نکہتؔ صاحب نے خواہش تو کی ہے کہ یہ اندازِ مجروح فرخروشانہ غزل کہیں لیکن ان کا یہ مزاج نہیں اور خود مجروحؔ کا مزاج بھی سرفروشانہ نہیں تھا۔ وہ تو بہ انداز جگرؔ شعر کہتے تھے۔ بمبئی کے ماحول نے انہیں ''ضرورتِ ترقی پسندی'' کے لیے دو ایک غزلیں ایسی کہنے پر مجبور کیا کہ ''مارلے ساتھی جانے نہ پائے'' یا ''اہلِ دل اگائیں گے کھیت میں مہ و انجم''۔ یا دو ایک اور غزلیں ورنہ مجروحؔ خود لطیف غنائی لہجے کے شاعر ہیں اور وہ ادب میں اپنی اُن چند غزلوں کے حوالوں سے ہی باقی رہیں گے جو

تھوپی ہوئی ترقی پسندی کے ذیل میں نہیں آتیں۔ آیئے اب ذرا ''حرفِ زیرِ لب'' کی سیر کریں ؎

کیسے کیسے گل کھلے ہیں اور کیا کیا رنگ ہیں
دار کی منزل سے کوئے دلبراں تک دیکھئے

دار کی منزل تو نکہت صاحب کے یہاں نظر نہیں آتی، ہاں کوئے دلبراں کی سیر کی جا سکتی ہے یہ تو فیضؔ کے دار، اور کوئے یار چلے، والے شعر کی یاد تازہ کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر فیضؔ جیل نہ جاتے اور اپنی بات کو غزل کے اشاروں، کنایوں میں نہ بیان کرتے تو غزل کا منظر نامہ کیا ہوتا۔ یہ کہنا مشکل ہے فیض نے خود کہا ہے کہ ہم نے جس طرح کہا وہ طرز عام ہوا چاہے نظم ہو یا غزل۔ فیضؔ Trend settes شاعر تھے، اور ان کی غزل کے بعد ترقی پسند شعراء نے جو غزل کہی اس پر کہیں کم کہیں زیادہ فیضؔ کی غزل کی چھاپ ہے۔ حد یہ ہے کہ سردار جعفری نے بھی اپنی غزل میں فیضؔ کا لہجہ اختیار کیا۔ نکہت بریلوی نے دار اور کوئے دلبراں کہہ کر غیر شعوری طور پر ظاہر کر دیا ہے کہ وہ فیضؔ کے اثر سے آزاد نہیں ہیں، لیکن اُن کے یہاں 'دار' کا ایسا استعمال بھی ہے کہ یہ لفظ ان کا ہو گیا ہے۔

صبا نہ روئیں ہمیں اہلِ کارواں، کہیو
ستارہ بن کے چمکتے رہیں گے دار سے ہم

ہر شاعر شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنی زندگی، اپنے غم، اپنے مسائل براہِ راست یا حدیثِ دیگراں کے طور پر بیان کرتا ہے۔ نکہت کے یہاں ان کی زندگی کی محرومیاں، الجھنیں اور شکایتیں ہیں۔ مگر ان کے یہاں یاسیت نہیں ہے۔ زندگی سے فرار نہیں ہے، تھکن نہیں ہے اور بیان میں چونکا دینے والی کیفیت ہے

اب تو یوں لگتا ہے نکہت جانے کیوں ہر آدمی
اپنے گھر آتا ہے، جیسے اپنے گھر آتا نہیں
یہ کیسا دور ہے کیا بے نیازیاں ہیں کہ لوگ
اک اجنبی کی طرح اپنے گھر میں رہتے ہیں
کسی پہ سنگ زنی کس طرح کریں نکہت
کہ ہم تو آپ بھی شیشے کے گھر میں رہتے ہیں
اس مقتلِ احساس میں ، اس دورِ ستم میں
نکہت جو گزر جائے غنیمت وہ گھڑی ہے
اے دل یہ کس عذاب کا موسم نگر میں ہے
باہر کوئی سکون کی صورت نہ گھر میں ہے
عجیب وحشتِ دیوار و در ہے کیا کہیے
مگر یہ گھر تو ہمارا ہی گھر ہے کیا کہیے

ان اشعار کی تہہ میں جو شکوے، شکایتیں اور محرومیاں ہیں وہ اہل نظر محسوس کر سکتے ہیں اور یہ ''گھر'' صرف ان در و دیوار کا احاطہ نہیں ہے جہاں نکہت صاحب رہتے ہیں، بلکہ یہ گھر ایک استعارہ ہے اس ماحول کا، اس معاشرے کا، اُس شہر اور اس ملک کا بھی جہاں ہمارا شاعر رہتا ہے۔ شکوہ کا اظہار کس خوبصورت پیرائے میں کیا ہے۔ سراسر غزل کی زبان ہے

کھلا ہی کب در میخانہ ہم سے رندوں پر
کہ ہم گزارش پیمانہ و سبو کرتے

نکہت صاحب نے ایک فعال زندگی گزاری ہے۔ ان کے زیرِ قدم ایک عالم رہا ہے۔ کبھی بریلی، کبھی شاہجہان پور، کبھی لاہور، کبھی سکھر اور آخر کراچی۔ یہ مقامات اُن کے لیے سیر گاہیں، دارالعمل رہے۔ ان کی زندگی کے سفر کی منزلیں اور ان منزلوں کا ذکر کرنا تم ممکن ہی نہیں جو شاعر کے ذہن میں ہیں۔ دراصل سفر تو وہی ہے جس میں انسان ہر وقت مبتلا رہتا ہے۔ ان کے کچھ اشعار ان کے ذہنی سفرنامے ہیں، نئے نئے تجربوں کے تناظر میں

گرفتِ گردشِ شام و سحر میں رہتے ہیں
یہی سفر ہے تو ہم بھی سفر میں رہتے ہیں
سوئے منزل فاصلوں کو ساتھ لے کر چل پڑے
ہم نے جب دیکھا کہ کوئی ہم سفر آتا نہیں
پلٹ آتے ہیں تھوڑی دور چل کر قافلے اپنے
کہ جیسے کم نہ ہوجائیں سفر میں فاصلے اپنے
کسے آواز دے کر اپنی تنہائی کا غم کاٹیں
کہاں گم ہو گئے، جو لوگ اب تک ساتھ تھے اپنے

اور ان کا یہ سفر تو دورِ جدید کے انسان کے سفر کا استعارہ ہے

خاک سے اٹھا فلک تک چھا گیا
کس جگہ سے میں کہاں تک آ گیا

نکہت بریلوی ایک باشعور انسان ہیں۔ ان کی نظر فتوحات پر بھی ہے اور اس کرۂ ارض پر، زندگی کی مشکلوں پر۔ ان مشکلوں کے دائرے میں بین الاقوامی طور پر انتشار پر بھی ہے اور وہ طاقتیں بھی جو اس کرۂ ارض کو کرۂ امن نہیں بننے دیتیں۔ غزل کا شعر کبھی کبھی اپنے معانی میں ایک جہان رکھتا ہے۔ ایک ایسا ہی شعر جو اس دینا پر طاری رات کے مسائل ہی پر الجھا ہوا ہے

مشکل ہے کہ آشفتہ بیانی میں گزر جائے
یہ رات نہیں وہ جو کہانی میں گزر جائے

نکہت بریلوی کی کتاب ''حرفِ زیرِ لب'' اگرچہ ان کی غزلوں اور کچھ نظموں پر مشتمل ہے، مگر ان کا اصل سرمایۂ سخن دراصل غزل ہی ہے اور غزلوں میں انہوں نے کچھ اشعار ایسے نکالے ہیں جو تخلیقی انبساط کی کیفیت پیدا کرتے ہیں اور اس کی بھی ضمانت ہیں کہ ان کی غزل کا سفر بہتر سے بہتر کی طرف ہے۔ فکر کی تازگی، بیان کی ندرت اور معانی کی تہہ داری اور سب سے بڑھ کر غزل کی روایت کا احترام اور فنی لوازمات کے ساتھ۔ یہ خصوصیات ہی شاعر کو صفِ اوّل کے فنکاروں میں جگہ دیتی ہیں

اہلِ علم و دانش کو جستجو اسی کی ہے
آدمی کے اندر ایک اور آدمی بھی ہے
سکوں مآب سمجھتے تھے جن کناروں کو
سمٹ کے حلقۂ گرداب ہوتے جاتے ہیں
دید کے قابل ہے ہر منظر کہاں تک دیکھئے
یہ جہاں کھلتا ہی جائے گا جہاں تک دیکھئے
آنکھ ہی کب خزاں نے لگنے دی
خواب کیا دیکھتے بہاروں کا
گو ایک دیا شب کی ظلمت نہیں کم کرتا
لیکن یہی کیا کم ہے ظلمت میں فروزاں ہے
بے حرف و صوت کوئی سخن ہو تو خوب ہو
حاصل جو یہ مہارت فن ہو تو خوب ہو

یہ آخری شعر تو غزل کے شعر کو تجریدی آرٹ کی سطح تک لے گیا ہے۔

ان اشعار پر لکھنے کے لیے کئی کئی صفحات بھی کم ہیں۔ ہمیں حمایت علی شاعر کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ انہوں نے ایسے عمدہ شاعر کو رسائل کے اوراق سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالا اور ایک ترقی پسند شاعر (جو ترقی پسندی کی ان کثافتوں سے دامن بچائے ہوئے ہے جن سے یہ تحریک زوال پذیر ہوئی) کو ادب کے منظرنامے میں لائے۔ آخر میں اُن کی ایک غزل کے چند اشعار پیش کرتا ہوں جن کی کیفیات کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ تشریح سے لطف زائل ہو جاتا ہے۔

کثیف ہیں صبح کی فضائیں نہ اخترِ شام بجھ گئے ہیں
جلائے تھے اہلِ شوق نے کچھ دیے لبِ بام بجھ گئے ہیں
نہ اب وہ احساسِ میکشی ہے، نہ مے کی تاثیر آتشیں ہے
طبیعتیں بجھ گئی ہیں اپنی کہ ساقیا جام بجھ گئے ہیں

☆☆☆

غلام حسین ساجدؔ

''نامعلوم'' کی دُنیا

صابر ظفر اور میرے درمیان بارہ شعری مجموعوں کی دُوری ہے۔ ہم ''ابتدا'' کی اشاعت کے کچھ وقت بعد بچھڑے تھے اور آج ستائیس (۲۷) برس کے بعد ''نامعلوم'' کے سفر میں پھر یک جا ہوئے ہیں۔ اِس بیچ میں صابر ظفر نے بہت کچھ مسافت طے کی ہے اور شاید میں نے بھی۔ کتنا بہت کچھ ہے جو ہمیں ایک دوسرے سے قریب اور الگ کر رہا ہے۔ تاہم خوشی کی بات یہ ہے کہ اِس باہمی کشش اور گریز کی ڈور ہمیشہ شاعری کے بے کنار اور لازوال وجود سے بندھی رہی ہے۔ اِس لئے ہم ایک دوسرے سے دور رہ کر بھی دور نہیں رہ پاتے اور ایک دوسرے کو رد کرنے کی کوشش میں ایک دوسرے کے قریب اور چلے آتے ہیں۔

''نامعلوم'' شعری وفور اور شاعرانہ کمال کے تال میل کی ایک نادر مثال ہے۔ زندگی اور زندگی سے جڑے ہوئے اسرار کو کھوجنے کی یہ کوشش، ایک تخلیقی اُپج بھی ہے اور ایک وجودی تجربہ بھی۔ یہاں معلوم اور نامعلوم ایک سِرّی رمزیت کے ساتھ ایک دوسرے سے آمیخت اور الگ ہوتے نظر آتے ہیں اور موجود و ناموجود کی بہت سی پرتیں ایک ماورائی تجربے کا حصہ بن کر وجدان پر کھلتیں اور آنکھ سے اوجھل ہوتی محسوس ہوتی ہیں مگر اِس ماورائی تجربے کو سمجھنے اور اس کا حصہ بننے کے لئے ہمیں ایک نظر صابرؔ ظفر کے شعری سفر پر ڈالنی ہوگی۔

''ابتداء'' (۱۹۷۵ء) صابرؔ ظفر کی پہلی کتاب تھی۔ ''ابتدا'' کو نئی غزل کی سمفنی میں بجا طور پر ایک منفرد اضافہ قرار دیا گیا تھا کہ اِس کتاب میں شامل غزلیں اپنے عہد کے آشوب کا استعارہ تھیں۔ زندگی اور زندگی سے جڑی پیچیدگیوں کی فلسفیانہ توجیہہ کرنے کی سعی کئے بغیر بھی صابرؔ ظفر اِس کتاب میں زندگی کی تمام تر پرتوں کو کھول کر دیکھنے میں کامیاب رہا تھا اور اُس کا موجود بے ساختہ وجود پانے والے عکس کی طرح اُس کے شعری وفور کے آئینے میں در آیا تھا۔ یوں ''ابتدا'' اپنے عہد سے فصل اور جذب کی تمام تر صورتوں کی امین بھی تھی اور ایک خوش کلام شاعر کے ظہور کی نوید بھی۔

''دھواں اور پھول'' (۱۹۸۵ء) میں ظفرؔ اقبال نے صابرؔ ظفر کی شاعری کو بجا طور پر سادہ لفظوں کی رنگ دار ساز باز قرار دیا تھا۔ اِس کتاب میں صابرؔ ظفر نے ''ابتدا'' کی سادگی اور بے مثل حیرت کو برقرار رکھتے ہوئے اپنی شاعرانہ بصیرت کا بھرپور ادراک کرایا تھا۔ ''ابتدا'' کے بعد کے یہ دس برس شاعر کے وجود پر بیتنے والی قیامت کی کتھا بھی ہیں اور ایک نئی دُنیا کے طلوع ہونے کے استعارہ بھی۔ یہ

کتاب جو آغاز میں دُھند میں راستہ تلاش کرنے کی کیفیت کا مظہر ہے، اپنے اختتام کے قریب ایک عجیب جہانِ حیرت کے ظہور کی خبر دیتی محسوس ہوتی ہے۔ شاعر کی دیکھی بھالی اور برتی ہوئی دُنیا میں سے ایک خاص طرح کی بے خبری کا اکھوا پھوٹتا ہے اور اُس کی آواز کی تہ داری میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔ لگتا ہے سادہ لفظوں کی اِس رنگینی کو ایک نئی سرزمین پر قدم جمانے کی ترغیب ملنے والی ہے۔ کچھ نیا اور انوکھا ہے جو شاعر کے وجود پر ظاہر ہونے کو ہے۔

یہی نئی اور انوکھی دُنیا ''پاتال'' (۱۹۸۷ء) کی دُنیا ہے۔ نامانوس، تہ دار اور کٹیلی - ہزاروں برس پہلے سومیرین دیوی عِشتارؔ کو اِسی سِرّی اندھیرے میں بے لباس ہو کر اُترنا پڑا تھا۔ صابرؔ ظفر کو بھی بحور و آہنگ اور فکری رَوّیوں کی سطح پر کئی ایک نامانوس منطقوں کا رُخ کرنا پڑا ہے۔ اندھیرے اور اجنبیت کا یہ سفر طے کرنا آسان نہ تھا مگر صابرؔ ظفر نے معمول سے ہٹی ہوئی بحروں کے استعمال، قدرے طویل غزلوں کی تخلیق اور سرزمین پنجاب کی کلاسیکی وراثت کے تال میل سے اس سفر کو آسانی سے کاٹ لیا ہے اِس طرح اِس کتاب میں وہ اپنے عہد کے آشوب کو آسانی کے ساتھ بیان کرنے اور اِس آشوب کے حوالے سے اپنے وجود میں آنے والی تبدیلی کا بھرپور احساس دلانے میں پوری طرح کامیاب رہے ہیں۔

''پاتال'' سے پلٹنے پر غالباً صابرؔ ظفر نے اپنے آپ کو ایک دوراہے پر پایا تھا۔ سو اپنے اگلے تین شعری مجموعوں ''جتنی آنکھیں اچھی ہوں گی'' (۱۹۸۸ء)، ''دریچہ بے صدا کوئی نہیں ہے'' (۱۹۹۰ء) اور ''لہو ترنگ'' (۱۹۹۲ء) میں وہ ایک نامانوس صوت و آہنگ کی تلاش میں اپنی نگاہ پر کھلنے والے اِس دوراہے پر بھٹکتا دکھائی دیتا ہے۔ ایک طرف وہ سُر اور تال کے توسط سے لوک گیتوں کی طرف کھلنے والے دریچوں میں جھانکنے کی سعی کرتا ہے تو دوسری طرف جدید اُردو غزل کی حِسیّت اور شعور سے قدم مِلا کر چلنے کا متمنی بھی ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ اِس پیکار میں اُس نے اپنے آپ کو وجودی اور روحانی سطح پر اپنے عصر اور اپنے موجود اپنی مٹی سے ہم آہنگ کرنے میں کامیابی پائی ہے جو شاعر کے اپنے قدموں پر مضبوطی سے کھڑے رہنے کا سبب بنی ہے اور جس نے اُسے ''غزل'' اور ''گیت'' کے نئے منطقوں کی طرف نکل جانے کا حوصلہ دیا ہے۔

''دُکھوں کی چادر'' (۱۹۹۴ء) شاعر کے وجدان پر کھلنے والا ایک ایسا ہی دلفریب منطقہ ہے۔ اِس کتاب میں صابرؔ ظفر ایک سچے شاعر کی طرح، اپنے وفورِ شعری کے ہاتھوں بے بس ہو کر جھومتا اور گنگناتا نظر آتا ہے۔ اِس کتاب میں اُس کے قدم پوری طرح اپنی مٹی پر ہیں اور سندھ، بلوچستان، سرحد اور پنجاب کی لوک کتھائیں اور کردار شاعر کے وجود پر غالب آ کر اُس کے موجود سے ہمکلامی کرتے دکھائی دیتے ہیں اور روپ اور رَس کی یہ پھوار صرف اُس کے گیتوں اور نظموں تک محدود نہیں بلکہ اِس کی چھوٹ اُس کی غزلوں پر بھی پڑتی نظر آتی ہے۔ اِس طرح ''دُکھوں کی چادر'' مٹی اور عوام سے جڑی ہوئی شاعری کا مجموعہ ہے اور صابرؔ ظفر کی شعری جہتوں میں ایک نئی تخلیقی اُپج کا امین بن کر سامنے آتا ہے۔ یوں لگتا ہے،

جیسے صابرؔ ظفر کے وجود میں پلنے والی محبت سے نمود کرنے والے کرداروں (عاشق و معشوق ہر دو) کو اپنے باطنی جدل کے اظہار کے لئے زبان ملنے والی ہو اور اُن کے لہو کی دمک ایک نئے شعری تجربے کے روپ میں ظاہر ہونے کو ہو۔

''بارہ دری میں شام'' (جون ۱۹۹۶ء) اسی تجربے کی توسیع ہے۔ یہ کتاب عاشق و معشوق پر گزرنے والی کیفیات سے مملو ہے اور اِس میں شامل طویل غزلیں وجود اور جوہر، بدن اور رُوح اور شاعر کے ظاہر و باطن کے اسرار کا پرتو بن کر سامنے آتی ہیں۔ قمر جمیلؔ مرحوم نے بجا طور پر اِسے عاشق و معشوق، ہر دو کی آوازوں کا سنگم قرار دیا تھا۔ اِس کتاب میں صابرؔ ظفر اُس روایت کی تکمیل کرتا دکھائی دیتا ہے جو ہندوی لحن اور فارسی شاعری کی روایت کو ایک ساتھ برتنے کی تخلیقی اُپج سے آغاز ہوئی تھی۔ اِس لحاظ سے جدید حسیت سے مملو شاعری میں یہ اپنی نوعیت کا غالباً واحد تجربہ ہے، جس میں آتشِ عشق کا گداز اور اور لذتِ گریہ کا تسلسل ایک خاص کیفیت پیدا کرتا ہے۔

''اک تری یاد رہ گئی باقی'' (جنوری ۱۹۹۸ء) صابرؔ ظفر کا نواں مجموعہ کلام تھا۔ اِس مجموعے کی غزلیں شاعر کے ایک نئے جہانِ معنی سے آشنائی کا پتا دیتی ہیں اور ان کے آئینے میں صابرؔ ظفر کے مزاج کے کئی پہلو منعکس ہوتے محسوس ہوتے ہیں۔ ''بارہ دری میں شام'' کے برعکس اِس مجموعے کی غزلیں شاعر کے موجود سے جڑی دکھائی دیتی ہیں۔ ان میں زندگی کو قلندرانہ وضع کے ساتھ بسر کرنے کا رنگ بھی ہے اور اُس سے بیزاری کا رویہ بھی۔ یہ کتاب ایک حکیمانہ بصیرت کے ساتھ عصری صورتِ حال میں شاعر کے مقام کا تعین کرتی ہے اور صابرؔ ظفر کے شعری آفاق کی وسعت کا حوالہ بن کر سامنے آتی ہے۔

اپنے اگلے مجموعۂ کلام ''عشق میں روگ ہزار'' میں صابرؔ ظفر نے ایک اور جہانِ شعری کو دریافت کیا ہے۔ اِس کتاب میں موضوع، زبان اور آہنگ کی سطح پر صابرؔ ظفر نے اپنے آپ کو پاکستانی زبانوں کی لوک شاعری کی روایت سے قریب رکھنے کی کوشش کی ہے۔ لفظیات، بحور و آہنگ اور فکری سانچوں کی ندرت کے ساتھ ساتھ اِس کتاب کے لہجے میں نسائی پرت کا اضافہ کر کے صابرؔ ظفر نے اپنے قاری پر ایک نئی لذت کا در وا کیا ہے اور مروجہ لوک داستانوں کے کرداروں کو عشق کی نئی کیفیتوں کی علامت بنا کر اپنے باطنی سچ کے اظہار میں بھرپور کامیابی پائی ہے۔ جس نے اِس مجموعے کو پاکستانی کلچر اور تمدن سے جوڑنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

''بے آہٹ چلی آتی ہے موت'' (۱۹۹۹ء) صابر ظفر کا اگلا مجموعہ کلام، اپنی اصل میں ایک حادثاتی کتاب ہے جو صابر ظفر کے جواں سال صاحبزادے کے قتل پر ایک موت سے بھی بدتر زندگی گزارنے والے باپ کے گہرے گھاؤ کھائے دِل کی پکار بن کر وجود میں آئی ہے۔ اِس نوعیت کی کتاب لکھی نہیں جا سکتی اور خدا نہ کرے کہ کوئی شاعر اِس نوعیت کی کتاب لکھنے کی مشقت پر مامور ہو۔ اِس کتاب کے ایک ایک لفظ کا ظہور رگوں میں زہر بنتے لہو سے ہوا ہے اور یہ اپنے قاری کو ایک خاص طرح کے حزن

اور ملال سے روشناس کراتی ہے کہ جس کی آنچ لہو میں اُترتی اور جس کا زہر زبان پر پھیلتا محسوس ہوتا ہے۔ اُردو شاعری کی روایت میں صابرؔ ظفر کی یہ کتاب ایک ایسی انفرادیت سے مملو ہے جو کسی اور غزل گو شاعر کے حصے میں نہیں آئی اور مری دُعا ہے کہ باری تعالیٰ ہر خوش فکر شاعر کو اِس نوع کے رَنج اور ملال سے محفوظ رکھے کہ غزل میں اِس نوع کی تاثیر کہولت کو قدم بڑھاتے باپ کے کاندھے پر جوان بیٹے کا لاشہ اُٹھا کر ہی جنم لے سکتی ہے۔ ''بے آہٹ چلی آتی ہے موت'' میں موت کا سایہ ایک تیز روندی کی طرح ہر غزل میں سرایت کرتا اور پھیلتا دکھائی دیتا ہے اور کتاب کے ایک ایک لفظ کو دائمی یاسیت، رنج اور حزن کے غبار سے بھر کر تمام نوعِ بشر کے لئے دُکھ اور احتجاج کا استعارہ بن جاتا ہے۔

''چین اک پل نہیں'' (۲۰۰۰ء) صابرؔ ظفر کا بارہواں مجموعہ کلام ہے۔ یہ مجموعہ چند غزلوں اور بہت سے گیتوں پر مشتمل ہے۔ جن کے حق میں صابرؔ ظفر کا یہ بیان ''وہ قارئین جو میری شاعری کے رنگ و آہنگ سے واقف ہیں۔ میں انہیں اِس کتاب کے ہر صفحے پر ملوں گا'' صرف تعلّی معلوم ہوتا ہے کیونکہ اِس مجموعے کے مطالعے کے دوران میں صابرؔ ظفر سے اگر کہیں ملاقات ہو پاتی ہے تو اس کتاب کے آخر میں شامل کی جانے والی چند غزلوں ہی میں اور اِن میں بھی خصوصیت سے اُس کی غزل ''کہیں نہیں تھا وہ معلوم اور کہیں معلوم'' میں کہ اِس غزل سے مجھے اُس کے زیرِ نظر شعری مجموعے ''نامعلوم'' کا دَروَا ہوتا محسوس ہوتا ہے، جس کا ذکر ایک وجودی تجربے کے طور پر پہلے بھی ہو چکا ہے۔

(۲)

''نامعلوم'' یک کیفیتی غزلوں کا مجموعہ ہے، جسے شادؔ عظیم آبادی کی زمین ''نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم'' کی بنیاد پر اُٹھایا گیا ہے۔ اِس مجموعے کی تمام غزلیں اِسی ''زمین'' سے وابستہ رہ کر زندگی کے ظاہر اور باطن کی عکس بندی پر مامور دکھائی دیتی ہیں اور بعض ایسے وجودی منطقوں کی خبر دیتی ہیں جو صابرؔ ظفر کی شاعری اور ذات پر اب تک وَا نہیں ہوئے تھے۔ اِس لئے کہ اُس کے گیارہویں شعری مجموعے ''بے آہٹ چلی آتی ہے موت'' کو چھوڑ کر صابرؔ ظفر کی شاعری موجود سے جڑی ہوئی شاعری ہے۔ اُس کی بعض کتابیں تو واضح طور پر ''فرمائشی'' ہیں اور جو فرمائشی نہیں ہیں۔ اُن پر بھی ذات سے مکالمہ کی بجائے عصر سے مکالمے کا رنگ غالب ہے۔ یوں لگتا ہے کہ شاعر کو اپنے اب تک کے سفر میں اپنے شاعر ہونے کا احساس اپنی ذات کی طرف متوجہ ہونے کی راہ نہیں دے رہا تھا اور غور کریں تو صابرؔ ظفر کے اِس فکری رویے کی نفسیاتی توجیہہ کرنا کچھ مشکل نہیں۔ اُس کی زندگی، پس منظر اور موجود میں ہمیشہ ایک پیکار کی سی کیفیت کا سلسلہ رہا ہے اور جب شاعر کو زندگی کی دشواریوں میں سے آسانی کی راہ تلاش کرنے کی سعی مسلسل کا سامنا ہو تو عصر رواں سے ہمدمی اور مکالمے کی صورت پیدا ہوتی ہی ہے۔ کہیں اُسے زیر کر کے باطنی تفاخر کا اظہار کرنے کے لئے اور کہیں اُس کے ہاتھوں کھیت رہ کر وجودی کرب کی شدت کی خبر دینے کو۔ یہی وجہ ہے کہ ''بے آہٹ چلی آتی ہے موت'' کے سوا صابرؔ ظفر کے دیگر تمام شعری مجموعے، صابر

ظفر اور اُس کے اردگرد سانس لیتی کائنات کے مابین ایک جدل کی سی کیفیت کا پتا دیتے ہیں اور یوں لگتا ہے کہ شاعر کے لیے اپنے موجود کے ردّ وقبول کے سوا زیست کرنے کو شاید کوئی اور راستہ نہیں اور کسی اور نوع کے فکری حوالے اور باطنی تجربے کو قابلِ قبول بنانے کی صلاحیت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے ورثے سے جڑنے کی شعوری کوشش اور اسلوب کی سطح پر ایک مجذوبانہ رویہ اختیار کرنے کے باوجود صابر ظفر کی شاعری پر کہیں بھی وجودی تجربے کا رنگ غالب نہیں آتا اور اُس کے باطن میں برپا ہونے والی قیامتوں کی جھلک شاذ و نادر ہی دکھائی دیتی ہے اور شاعر کو موجود سے مکالمے کے سوا کسی اور سمت میں نکل پانے کی راہ مِل نہیں پاتی۔

''نامعلوم'' میں شاعر نے اس چوتھی کھونٹ کی طرف نکلنے کی سعی کی ہے، جس کی طرف نکلنے کی اُسے فرصت نہیں مِل پا رہی تھی۔ اِس شعری مجموعے میں صابر ظفر نے اپنے اردگرد پر نگاہ رکھنے اور عصرِ رواں سے فکری ہمدمی کی عادت کو تج کر اپنی ذات، اپنے وجود اور اپنی روح سے مکالمہ کرنے کی ٹھانی ہے بلکہ اِس کتاب کا مکا شفاتی رنگ اِس امر کی گواہی دیتا ہے کہ شاعر کے فکری ابعاد میں یہ نیا رنگ کسی شعوری کوشش کے ذریعے پیدا نہیں ہوا۔ ''بے آہٹ چلی آتی ہے موت'' سے اِس مکاشفے کا راستہ کھلنا ہی تھا اور شاعر کا اپنے باطن، اپنی ذات کی طرف پلٹ کر آنا لازمی تھا۔ اِس لئے کہ موجود سے تعلق توڑنے کے بعد (کہ جس کی وجوہات شاعر اور قارئین پر بخوبی ظاہر ہیں) شاعر کو اپنی ذات، اپنے وجود پر نگاہ ڈالنی ہی تھی اور اُن اِستفسارات کے بالمقابل آ کھڑا ہونا ہی تھا جو پہلے شاعر اور پہلے انسان پر وارد ہوئے تھے اور جن کے جواب تلاش کرنے کی ذمہ داری، آخری شاعر اور آخری اِنسان تک کو نبھانی ہے۔ ''نا معلوم'' میں صابر ظفر انہی استفسارات اور اِسی مخمصے سے دوچار ہے اور اپنے آپ کو دریافت کرنے کی سعی مسلسل میں جُتا ہے، چند شعر دیکھیے۔

وجود کیا ہے، عدم کیا ہے، کچھ نہ تھا معلوم — میں روبرو تھا کسی کے، تھا کون کیا معلوم!
مرے خیال میں وہ زندگی نہیں کہ جو ہے — اگر وہی ہے تو کیا ہو گا انت کیا معلوم
ازل سے پہلے تھا کیا اور ابد کے بعد ہے کیا — یہ معجزہ کوئی ہو گا ، اگر ہوا معلوم
اَزل اَزل سے ، اَبد سے اَبد ہوا معلوم — جو میں نہیں تھا تو کیسے ہوا خدا معلوم
کہیں کہیں ہوا منظر بہشت کا معلوم — وہ خواب تھا کہ حقیقت نہیں ہوا معلوم
یہ کائنات ہے اُس کی تو پھر ہے اپنا کیا — وہ ساتھ رہ کے بھی کیوں ہو علاحدہ معلوم

اِن اشعار اور ان میں اُٹھائے گئے سوالات سے اِس بات کا شائبہ ہوتا ہے کہ ''نامعلوم'' میں صابر ظفر نے شاید صوفیانہ شعری روایت کا اَحیا کیا ہے سو مجھے اِس موقع پر یہ بات اصرار کے ساتھ کہنی ہے کہ ''نامعلوم'' صوفیانہ شعری روایت کی کتاب نہیں۔ اِس عہد میں شاید اِس نوعیت کے تجربے کی گنجائش ہی نہیں۔ تاہم اِس کتاب میں ذات اور ماورائے ذات پر منکشف ہونے والے باطنی تجربوں کی چھاپ

ضرور ہے اور یہ کیفیت اِس کتاب کی ردیف ''معلوم'' سے پیدا ہوئی ہے۔ یہ لفظ (معلوم) اپنے اندر بہت سے رنگ لئے ہے، جن کے موہوم ریشے زندگی کے حقائق اور غیب کے اَسرار سے جڑے ہیں۔ ظاہر و باطن، حاضر و غائب، معلوم و نامعلوم کے کئی سلسلے ہیں جو اِس کتاب میں پھیلتے اور سکڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ جن کے دُھندلکے میں شاعر کی تخلیقی اُپج ایک چراغ کی طرح ٹمٹماتی دکھائی دیتی ہے۔ ایک گہری دھند میں راستہ بناتی شمع کی طرح، جس کا وجود اپنے موجود کو منور کرنے کی کوشش میں اپنی ذات میں سمٹنے پر مجبور ہو۔ شاعر کی ذات بھی ایک اُمید و بیم کی سی کیفیت میں، ایک گہرے اندھیرے اور منوّر اُجالے کے مقامِ اتصال پر بھٹکتی محسوس ہوتی ہے مگر معلوم اور نامعلوم کا کُہرا ہے کہ چھٹنے ہی میں نہیں آتا اور حاضر و غائب کی تفریق ہے کہ مٹنے ہی میں نہیں آتی، دیکھیے یہ چند اشعار:

میں کس کو ترک کروں، کس کو اختیار کروں — کہ دونوں رستے ہیں معلوم اور نا معلوم!
نہیں اُسے کوئی احساس میرے ہونے کا — مقابل آئینے کے کیا ہو آئینہ معلوم؟
کِسی کی طرح تو کیا، خود سے مختلف ہوں میں — جو میں ہوں، میں تو نہیں ہوں، میں کیا ہوں کیا معلوم!
اُدھر بھی کچھ نہیں جا کے اُدھر ہوا معلوم — سو اب میں صرف بھٹکنے کا راستہ معلوم
مجھے تو جو ہوا معلوم ، سو ہوا معلوم — مگر یہ لوگ ہیں کیا اور انہیں ہے کیا معلوم!
کچھ ان لکھے کی خبر ہے، کچھ اَن کہا معلوم — سو طے ہوا کہ ہے معلوم سے سوا معلوم

مگر ''نامعلوم'' کا پھیلاؤ معلوم و نامعلوم یا ظاہر و باطن کے مقامِ اتصّال پر کھڑے ہو کر نظارہ کرنے اور اِس دُھندلکے میں راہ بنانے کی جدوجہد کرتے چلے جانے تک ہی نہیں۔ صابر ظفر نے اِس دائرے کو اپنے ماحول، فکری وراثت، تخلیقی رفعت اور کاروبارِ عشق میں پیش آنے والے سِری حقائق تک پھیلا دیا ہے، جس سے اُس کے لئے ''من و تُو'' سے مکالمے کے علاوہ قریب اور دور کے مظاہر پر نگاہ ڈالنا آسان اور سفرِ حیات کی ہر قابلِ ذکر واردات کا بیان کرنا سہل ہو گیا ہے۔

''نامعلوم'' کی غزلیں معلوم و نامعلوم، ہجر و وصال، ظاہر و باطن، موت و حیات اور عشق و عاشقی کی بہت سی پَرتوں کی اَمین ہیں۔ اِس طرح اِس کتاب میں ہر نوعیت کا تجربہ سمٹ آتا ہے۔ اِس سے جہاں اِس شعری مجموعے کی فکری سرحدیں وسیع ہوئی ہیں وہیں اِسے اُردو غزل کی روایت سے وابستہ رہنے اور جدید ترین فکری احساس سے آمیخت ہونے میں بھی کامیابی ملی ہے۔ جس سے ''نامعلوم'' ایک شاعرانہ اُپج کی سطح سے بلند ہو کر ایک ایسے وجودی تجربے کی امین بنتی دکھائی دیتی ہے، جسے آگے چل کر ایک نئی شعری روایت کا پیش رو بننا ہے۔

(۳)

''نامعلوم'' اپنی اصل میں ''عشق کتھا'' کے سوا کچھ اور نہیں۔ صنفِ غزل سے معاملہ ہونے

کے باعث یہ کتھا مربوط اور مسلسل ہے نہ ہوسکتی تھی مگر اِس کی مجموعی فضا پر ایک باطنی تعلق کا احساس بہرصورت غالب ہے۔ اس تعلق کو ''محبوب''، ''رازداں''، ''موجود'' اور ''غیر موجود'' (مجھے اِن اصطلاحات پر اِس لئے انحصار کرنا پڑا ہے کہ صابر ظفر کے مکالمے کی مختلف جہتوں کی تفہیم کے لئے مجھے اور کوئی راہ مل نہیں پائی) سے مکالمے کی رنگارنگی نے اور بھی دلفریب بنادیا ہے۔ پہلے دیکھیے ''محبوب'' سے براہِ راست مکالمے کی چند صورتیں:

میں اِس لئے تجھے اپنے قریب پاتا ہوں — نہیں جدائی کا کوئی بھی ثانیہ معلوم
اُٹھاؤ پلکیں کہ آنکھوں کی روشنی میں چلوں — کسی طرح ہو محبت کا راستہ معلوم
ہمیں تو کچھ بھی نہیں ہے ترے سوا معلوم — خدا کرے کہ نہ ہو کوئی دوسرا معلوم
نہ تجھ کو چھین کے رکھوں گا اپنے پاس کبھی — ضرور تجھ سے کروں گا تری رضا معلوم
اگر یہ رنگ ترے رنگ سے نہیں نکلا! — تو پھر یہ ہوتا ہے آنکھوں کو کیوں بھلا معلوم
وسیع کرتے جو دامن تو فیض اُٹھاتا میں — مگر ہوئی نہ تمہیں میری اِشتہا معلوم
نہ دل گیا نہ زمانے کا غم ہوا معلوم — جو تُو گیا تو ہوا ایک سانحہ معلوم
وگرنہ عشق کسی قید میں نہیں رہتا — تری نگاہ کا ہو یہ محاصرہ معلوم
وگرنہ ہجر کی یہ دھوپ جانے والی نہ تھی — ترے وصال کا سایہ ہوا گھنا معلوم

آپ نے دیکھا کہ اِن اشعار میں تخاطب واضح طور پر ''محبوبِ مجازی'' (میں اِس یبوست زدہ اصطلاح کے استعمال پر شرمندہ ہوں) سے ہے اور شاعر ایک خاص طرح کی سرشاری میں اُس پر اپنے عشقیہ تجربات کا اظہار کیے جارہا ہے مگر کچھ آگے چل کر شناخت اور موجود کا یہ جہان بدلنے لگتا ہے اور عشق کی واردات ذاتی سطح سے بلند ہوکر ماورائی حدود کو چھونے لگتی ہے، جس سے مکالمے کا دائرہ ہی نہیں پھیلتا، شاعر کے فکری تموّج اور وقار میں بھی اضافہ ہوتا ہے، ملاحظہ ہوں یہ چند اشعار:

بہت سے لوگ ترے رنگ میں ہیں ڈوبے ہوئے — اِسی لیے مجھے ہوتے ہیں آشنا معلوم
وہ لوگ بخشے گئے جو تری پناہ میں تھے — تری پناہ میں آئے تو یہ ہوا معلوم
تو جگنوؤں سے جُدا اور تتلیوں سے جُدا — کچھ اور تیری ادا اور وہ بھی نامعلوم
تو کیا نہیں ہے مری یاد بھی ترے دل میں — تو کیا نہیں ہے تجھے کوئی مبتلا معلوم
نہ کونج دانہ چُنے اجنبی پرندوں میں — اور ایک تُو کہ سبھی کا ہو آشنا معلوم
بلند ہو کے تصور سے اور تخیل سے — ترے مقام کا مجھ کو ہوا سِرا معلوم
یہی تو دکھ ہے کہ بے موت مر رہا ہوں میں — نہ تو ملا نہ ہوا دل کا فیصلہ معلوم
تو میری بات سے پہلے مری خموشی سُن — کہ جو نہیں تجھے معلوم کر ذرا معلوم
ترے خرام سے گھر میں کشادگی آئی — مکان ہونے لگا ہے کھلا کھلا معلوم

میں صرف ہوتا ہوں حتیٰ کہ میں نہیں رہتا — نہ ہو یہ کاش کسی کو ترے سوا معلوم

''محبوب'' سے اِس مکالمے کی تیسری پرت عدم سے ہم کلام ہونے کی ہے، جس کی بنیاد ''بے آہٹ چلی آتی ہے موت'' میں رکھی گئی تھی اور جس نے شاعر کے وجود کو ایک دائمی حُزن اور ملال کے رنگ میں رنگ دیا ہے۔ اِس نوع کے اشعار میں ''محبوب'' کا جو تصور دَر آیا ہے اور عشق کی جو کیفیت اور سطح ظہور پذیر ہوئی ہے وہ اُردو شاعری میں اپنی نوعیت کا اوّلین تجربہ ہے اور ایسے اشعار (جنہیں اشعار نہیں نشتر کہنا زیادہ مناسب ہوگا) ہر آن مرتے رہنے کی کیفیت میں مبتلا رہ کر ہی کہے جاسکتے ہیں:

تمہیں تو صرف تھی چلتی ہوئی ہوا معلوم — مگر نہ تھا کوئی بجھتا ہوا دِیا معلوم
نہ دھیان دوں تو نہ جائے تمہاری جانب دھیان — اور آئے دھیان تو ہو دل کو چیرتا معلوم
ترے بغیر گزاری ہیں گو کئی عیدیں — مگر جدائی جدائی ہے ، یہ ہوا معلوم
اجل کے ہم ہیں ہدف ،تم ہو زندگی کی طرف — اور ایک دوجے کا ہے کب اَتا پتا معلوم
تری حیات وہی ہے ، تری نجات وہی — اگر تجھے ہو کبھی غم شہید کا معلوم
وداع کرنے کا ہے حوصلہ کہاں مجھ میں — کوئی وداع ہوا تو مجھے ہوا معلوم
اُسے نہ روؤں تو پھر اور کس کو روؤں میں — بچھڑتا جسم سے ٹکڑا ہو جان کا معلوم
ہے جانا سہل کہاں زندگی کو ٹھکرا کر — جو تُو گیا تو ہوا تیرا حوصلہ معلوم

(۴)

محبوب سے براہِ راست مکالمے کی مذکورہ بالا پَرتوں کے علاوہ ''نامعلوم'' خودکلامی کی کیفیت سے بھی مملو ہے اور ماسوا سے مکالمے کا رنگ بھی لیے ہے۔ اِس نوع کے اشعار کی طرف توجہ دلانے کو مجھے اِس کتاب کی اکثر غزلوں کو نقل کرنے کی مشقت اُٹھانا ہوگی۔ اِس لیے میں اشعار کے انتخاب کو محدود تر کرتے ہوئے خودکلامی ماسوا سے مکالمے کے فکری ابعاد کی طرف سرسری توجہ دلانا پسند کروں گا۔

صابر ظفر کے یہاں خودکلامی یا مونولاگ کی صورت عموماً دو طرح کے تجربوں سے گزرنے کے بعد وجود پاتی ہے۔ اوّل، ذات پر منکشف ہونے والے اسرار (یعنی معلوم) اور دوم، ذات پر ظاہر نہ ہونے والے اسرار (یعنی نامعلوم) کے بیان کے ضمن میں، غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ان دونوں کیفیتوں میں قدرِ مشترک شاعر کی ذات ہے جو معلوم کے اُجالے اور نامعلوم کے دھندلکے میں بھٹکتی پھرتی ہے اور ان دونوں کیفیتوں کا اظہار کرکے، ان دونوں کیفیتوں میں اشتراک کی کوئی صورت پیدا کرنے کی سعی میں لگی ہے۔ ''نامعلوم'' کی غزلوں کے مطالعے سے معلوم پڑتا ہے کہ صابر ظفر نے خودکلامی کی ان دونوں صورتوں کا حق ادا کیا ہے اور اِس سے کتاب میں جو تخلیقی رفعت پیدا ہوئی ہے، وہ اُردو غزل کے بہت کم مجموعوں کا مقدر بنی ہوگی۔ ایک دائرے میں چلتے ہوئے، ایک ہی زمین (شعری) سے وابستہ رہ کر احساس، خیال اور فکر کی سطح پر اِس تخلیقی رفعت کا برقرار رکھنا کچھ صابر ظفر ایسے سچے شاعر کے لیے ہی ممکن

ہوسکتا تھا اور اِس کارنامے پر وہ بجا طور پر داد کا مستحق ہے۔ ملاحظہ ہوں یہ چند اشعار:

ہزار بار تو کیا ایک بار غم کا سبب — نہیں ہوا تو سمجھ لو نہیں ہوا معلوم
میں خاک سے اِدھر، افلاک سے اُدھر دیکھوں — مگر نہ ہو کسی ہمزاد کا پتا معلوم
کبھی کبھی وہ ہماری طرف بھی دیکھتے ہیں — وگرنہ اُن کے تغافل کی انتہا معلوم
زبان کھولنا گویا زباں درازی ہے — اگر نہیں ہے اُسے میرا مدعا معلوم
میں سوچوں ایسے کہ سوچوں میں ڈوبتا جاؤں — کسی طرح نہ کنارا ہو سوچ کا معلوم
تکون سی ہے خدا ، کائنات اور بشر — مگر مجھے تو ہو گردش میں دائرہ معلوم
وہ عشق لے گیا بے داغ آگہی کی طرف — اور ابتدا میں ہوئی خوب انتہا معلوم
میں زندگی کو بہت بے خبر گزارتا ہوں — مرے لیے تو ہے ہر ایک سانس نا معلوم
ازل سے پہلے بھی تُو تھا اگر تو میں بھی تھا — کہ تُو تو مجھ ہی کو پہلے پہل ہوا معلوم

اب آیئے ماسوا سے مکالمے کی طرف جو دراصل ماورائے ذات مکالمے کی ایک صورت ہے۔ ظاہر ہے کہ شاعر کے لیے اپنی ذات سے جدا ہونا کسی صورت میں بھی ممکن نہیں ہوسکتا مگر ماسوا کی سریت اُسے ذات سے الگ کرنے کی سعی ضرور کرتی ہے۔ موجود اور عدم میں کتنا بہت کچھ ہے جو پردۂ راز میں ہے اور جس کی کیمیا کا بھید کھول پانا ممکن نہیں مگر صابر ظفر نے اپنے آپ کو صرف اُن ازلی اسرار کی طرف توجہ دلانے تک محدود نہیں کیا۔ اپنی تخلیقی اُپج کی بنا پر اُن کے بھید کھولنے اور اُن کی معنویت کے دَر وا کرنے کی سعی بھی کی ہے۔ جس سے ''نامعلوم'' کے ''نامعلوم'' میں ایک خاص طرح کے ''معلوم'' کا ذائقہ پیدا ہوا ہے اور بہت کچھ اَن جانا، نامعلوم اور پُر اسرار نہیں رہا، ملاحظہ ہوں یہ چند اشعار:

یہ زندگی نہ ہماری ہو زندگی جیسے — کسی طرح بھی نہ ہو ہم سے واسطہ معلوم
یہ کون لوگ ہیں، کس آسماں سے آئے ہیں — یہ اپنے حُسن میں ہوں، سب سے ماورا معلوم
ازل سے پہلے تھا کیا اور ابد کے بعد ہے کیا — یہ معجزہ کوئی ہوگا اگر ہوا معلوم
میں کس کو ترک کروں، کس کو اختیار کروں — کہ دونوں رستے ہیں معلوم اور نامعلوم
کوئی خیال نہیں جس کو نظم کر نہ سکوں — ترا خیال ہی مجھ کو نہیں ہوا معلوم
بھٹک رہے ہیں وہ حیرت کے راستوں سے الگ — سو کیا انہیں ہو کسی رُخ سے ماورا معلوم

(۵)

''نامعلوم'' میں مقاماتِ وصل کے بیان اور محبوب سے براہِ راست مکالمے کا رنگ اِس قدر غالب ہے کہ اِس کتاب کی مجموعی فضا کو کیف آگیں اور نشاطیہ ہونا چاہیے تھا مگر ''نامعلوم'' کے عمیق مطالعے سے اِس امر سے آگاہی ہوتی ہے کہ ان غزلوں کا مجموعی لحن بڑی حد تک یاسیت اور حُزن و ملال کی کیفیت لیے ہے۔ ایک بے چہرہ دُکھ کا سایا ہے جس نے احساس اور تاثر کی سطح پر کتاب کے حقیقی وجود کو

اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے اور اُس کی نشاطیہ سرمستی کا رُخ زندگی کے اُن حقائق کی طرف موڑ دیا ہے جو رنج، تشکیک اور عدم کی آنچ سے لبریز ہوتے ہیں اور جن سے باہر نکلنے کا راستہ تلاش کرنے کی صورت بن نہیں پاتی۔ ایک نہ ختم ہونے والی اسیری ہے جو شاعر کو تمام عمر ایک اُمید و بیم کی سی کیفیت میں مبتلا رکھتی ہے اور اُس کے مجموعی لحن پر سے ملال کے رنگ کو دُھلنے نہیں دیتی۔ صابر ظفر نے ''نامعلوم'' میں دُبدھے کی اِس کیفیت کی طرف بلیغ اشارے کیے ہیں اور اُن اسرار سے پردہ اُٹھانے کی سعی کی ہے جو ''نامعلوم'' کی مجموعی فضا کو ایک خاص نوع کے حُزن سے روشناس کرنے کا سبب بنے ہیں:

اُدھر بھی کچھ نہیں ، جا کے اُدھر ہوا معلوم — سو اَب ہے صرف بھٹکنے کا راستہ معلوم
مگر وہ خواب ، ابد تاب ہی رہے محراب — کسی دیے کا نشاں تک نہیں رہا معلوم
اِدھر لگن کا افق اور ادھر اگن کا اُفق — کسی اُفق میں تو ہو ہم کو ڈوبنا معلوم
تُو میری بات سے پہلے مری خموشی سُن — کہ جو نہیں تجھے معلوم ، کر ذرا معلوم
نہ خوش گمان ہو اِتنا کہ دل کا حال تجھے — ہوا ضرور مگر سرسری ہوا معلوم
یہ جانے والے کو حسرت سے دیکھنا میرا — اگر نہیں ہے محبت تو کیا ہے کیا معلوم
چراغ دونوں سروں سے جلے تو کیسے جلے — علاقہ عشق کی آتش کا اُس کو کیا معلوم

سچ ہے چراغ کا دونوں سروں سے جلنا ممکن نہیں مگر چراغ کو شاعر کے وجود کا استعارہ مان لیا جائے تو اِس کا دونوں سروں سے جلنا ممکن بھی ہے اور ضروری بھی کہ اِس کے بعد ہی شاعر کے لیے معلوم و نامعلوم کی سرحدوں کو اپنی تخلیقی اُپج کے ذریعے ایک دوسری سے ملا دینا ممکن ہوسکتا ہے۔ صابر ظفر نے ''نامعلوم'' میں ایک نئے شعری لحن کی دریافت کے ساتھ ساتھ وجود و عدم، حاضر و غائب، ظاہر و باطن اور عکس و معکوس کے مابین وصال کی سی کیفیت کو جنم دیا ہے اور اپنے تخلیقی کمال کی قوت سے معلوم اور نامعلوم کی تفریق کو مٹا کر اُردو غزل کی تاریخ میں ایک نئی فکری روایت، ایک نئی دُنیا کی بنیاد رکھی ہے، جس کی داد اُسے بہر صورت ملنی ہی چاہیے۔

☆☆☆

ابن حسن جمالیات(۲)

ادب اور معروضی حقیقت

خالد محمود سنجرانی

''دل بھٹکے گا'': ناول یا آپ بیتی

بڑے قد کے تخلیقی فنکار فن کے مروّجہ پیمانوں کے پابند نہیں ہوا کرتے اور نہ ہی درسی اکتساب کے مرہونِ منت۔ ہر عہد کا بڑا فنکار اپنے لیے فنون کے ضابطے اور سانچے خود ڈھالتا ہے۔ تخلیق کار کی اس خاص اُفتاد کے علاوہ ایک اور اہم بات یہ ہے کہ ہر صنفِ ادب کے شناختی نشانات زیادہ عرصہ ایک ہی ڈگر پر نہیں رہتے۔ ان میں تبدیلی کا عمل اگر ممکن نہ بھی رہے تو نئے عہد کی دستک از خود ایک نئے دریچے کو وا کر دیتی ہے۔ اردو ناول میں لگے بندھے اُصول مدتِ مدید تک جاری رہے۔ قدیم ناول کے ہیتی، فکری اور فنی مبادیات کو ممتاز مفتی کے ''علی پور کا ایلی'' نے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ تب اس بات پر خاصی لے دے بھی ہوئی کہ مفتی کے ناول اپنے فنی حوالوں سے آپ بیتی سے قریب تر ہیں۔ جب مفتی نے بھی اعتراف کر لیا کہ یہ ناول ان کی آپ بیتی ہے اور ناول کے آخری صفحات میں کرداروں اور مقامات کے اصل نام تک درج کر دیئے گئے تو فنون کے عہدِ زریں کے پر جوش حامیوں کی تحریروں میں طمانیت کا اظہار ہونے لگا اور ''فاعلاتن فاعلات'' کی گردان کرنے والوں نے مفتی کے ناولوں کو فنِ ناول نگاری کے دائرے سے خارج کر دیا۔ دراصل، یہ ناول کی ہیئت اور تکنیک کی وہ ابتدائی کروٹ ہے کہ جس کی شکنیں احمد بشیر کے نئے ناول ''دل بھٹکے گا'' پر دکھائی دیتی ہے۔

فنی اعتبار سے جو چیز ناول کو آپ بیتی کے مسلمہ فن سے ممتاز کرتی ہے، وہ غیر شخصی انداز ہے۔ بڑا تخلیق کار اپنے ذاتی حالات و واقعات اور مشاہدات کو پیرتا ہوا وہاں جا کر دم لیتا ہے کہ جہاں شخصی حوالے ازل و ابد کی حیرتوں اور مجموعی لاشعور میں جا کر ضم ہو جاتے ہیں۔ پھر کوئی ایک بھی حوالہ ذاتی نوعیت کا نہیں رہتا۔ تخلیق کار کا یہی ہنر ہے کہ وہ ان وسائل کو بروئے کار لاتا ہے کہ جن کے سبب تخلیق سے ذاتی چھاپ دور ہو سکے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہر تخلیق ''آپ بیتی'' کی بنیاد ہی پر استوار کی جاتی ہے۔ یہ آپ بیتی خارجی عوامل پر مبنی ہو یا خاصے گہرے داخلی محسوسات پر۔ تخلیق کار کا کام اپنے مشاہدات اور تجربات کو غیر شخصی انداز میں سامنے لانا ہے۔ اس حوالے سے فرائیڈ نے کہا:

> "A man who is a true artist has more at his disposal. In the first place, he understands how to work... in such a way as to make them lose what is too personal..."(1)

دیکھنا یہ ہے کہ احمد بشیر نے ''دل بھٹکے گا'' میں اپنے خالصتاً ذاتی حوالوں کو کس حد تک اجتماعی اور فنی سانچوں میں ڈھالا ہے۔ مثال کے طور پر انہوں نے اپنے لئے جمال کا نام برتا ہے۔ اگر یہی معاملہ

وہ دیگر اشخاص کے باب میں برتتے تو یہ عمل زیادہ موثر ثابت ہوتا۔ انہوں نے ممتاز مفتی، حسرت موہانی، چراغ حسن حسرت اور حفیظ جالندھری کا تذکرہ اصل نام کے ساتھ کیا ہے۔ اس نوع کی دیگر مثالیں بھی کتاب میں موجود ہیں۔ کرداروں کی پیش کش کا یہ انداز آپ بیتی کا تاثر لیے ہوئے ہے۔ مقامات کا ذکر کرتے ہوئے احمد بشیر نے چند مقامات کے فرضی نام استعمال کیے جبکہ بہت سوں کو اصل نام کے ساتھ درج کیا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ ناول اگر تبدیلی قالب کا تقاضا بھی کرے تو تب بھی اصل ناموں کی گنجائش اس میں اس لیے نہیں نکلتی کہ ذاتی اور شخصی حوالے تخلیقی جہت کو نمایاں ہونے میں معاونت نہیں کرتے۔ منٹو نے ''ترقی پسند'' میں جبکہ بیدی نے ''نئے دیوتا'' میں ایک دوسرے کا خوب خاکہ اڑایا ہے۔ انہی شخصی حوالوں کے سبب یہ دونوں افسانے جست بھر کر منٹو اور بیدی کے عمدہ افسانوں کی قطار میں شامل نہ ہو سکے۔ ابوسعید قریشی نے ''منٹو'' میں سوگندھی کا تعین کیا، ''کالی شلوار'' کی سلطانہ کا سراغ لگایا لیکن اس انکشاف کے باوجود یہ دونوں افسانے اپنا تخلیقی لطف قائم رکھے ہوئے ہیں کہ منٹو نے اُن شخصی کوائف کو انسانی رویوں سے جا ملایا۔ احمد بشیر کے ہاں کرداروں کے اصل نام اگرچہ شخصیات کے رجحانات فراہم کرتے ہیں اور نہایت عمدہ انداز میں چلتی پھرتی تصویریں دکھاتے ہیں لیکن ناول کی تخلیقی فضا میں قدرے کھٹکتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

احمد بشیر کی اس سے پہلے ''جو ملے تھے راستے میں'' نہایت عمدہ کتاب ہے۔ خاکہ نگاری کی روایت میں ''جو ملے تھے راستے میں'' میرے نزدیک تو کلاسیک کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی سے احمد بشیر کی آپ بیتی کے الجھے سلجھے اور بکھرے ہوئے نقوش سامنے آتے ہیں۔ احمد بشیر کا تفصیلی تذکرہ ''علی پور کا ایلی'' بالخصوص ''الکھ نگری'' میں موجود ہے۔ مذکورہ تینوں کتب میں احمد بشیر کے نقوش ایک بڑے پیمانے پر ''دل بھٹکے گا'' میں موجود ہیں۔ ''الکھ نگری'' کے احمد بشیر اور ''دل بھٹکے گا'' کے احمد بشیر میں نمایاں تفاوت دیکھنے کو ملتا ہے۔ اب معلوم نہیں کہ ڈنڈی مفتی نے ماری ہے یا خود احمد بشیر نے۔ ''الکھ نگری'' میں احمد بشیر ایمن آباد کے ریلوے اسٹیشن پر ہندوؤں کی گاڑی کو بھرپور جذبے کے ساتھ کاٹتا ہوا نظر آتا ہے اور اس مقصد کے لیے مفتی کو نہ صرف لاہور سے ساتھ لے جاتا ہے بلکہ اسے اکساتا بھی ہے جبکہ ''دل بھٹکے گا'' کا احمد بشیر بہتا ہوا خون نہیں دیکھ سکتا:

> ''حکم آیا کہ سورج نکلتے ہی گاڑی پر حملہ کر دیا جائے کہ جو رہ گیا سو رہ گیا۔''
> ڈونڈی کی آواز سن کر جمال کا دل بیٹھ گیا۔ مشتاق نے کہا ''چلو ہم بھی چلتے ہیں۔ دیکھیں کیا ہوتا ہے۔''
> جمال نے کہا: ''چھوڑو۔ بے گناہ لوگ قتل ہوں گے۔ بہتا خون ہم سے نہ دیکھا جائے گا۔'' (۲)

اردو شاعری نے تو فسادات کا منظر نامہ پیش نہ کیا البتہ یہ بار افسانوی ادب میں اٹھانے کی تڑ

موجود تھی، اس لیے اردو کا افسانوی ادب فسادات کا بوجھ اٹھا گیا۔ اردو کے قاری کے لیے فسادات کوئی نیا موضوع نہیں ہے لیکن ''دل بھٹکے گا'' میں جہاں جہاں اس کا ذکر آیا ہے، وہ انسان کے رونگٹے کھڑے کر دینے کے لیے کافی ہے۔ ''دل بھٹکے گا'' میں فسادات کا حصہ پڑھتے ہوئے اب بھی انسانیت کا سر کرب آمیز شرم سے جھک جاتا ہے۔

''دل بھٹکے گا'' کی وساطت سے مغربی پنجاب کے فسادات کا تفصیلی منظر نامہ اردو ادب میں شاید پہلی بار اتنے موثر انداز میں ہوا ہے۔ اگرچہ ممتاز مفتی نے بھی ''الکھ نگری'' کرشن نگر کے حالات بیان کیے تھے مگر احمد بشیر نے شاہ عالم، کرشن نگر اور ایمن آباد میں ہونے والے فسادات اس انداز سے بیان کیے ہیں کہ سرحد کے اِس پار ہونے والے ظلم کو اپنی ذات اور قوم کے سر لینے کا حوصلہ دکھائی دیتا ہے۔

''دل بھٹکے گا'' میں مسلمان عورتوں کی رحم دلی اور جذبۂ انسانیت کی جو تصویر پیش کی گئی ہے، وہ نہ صرف قابلِ فخر ہے بلکہ انسانیت کی مشترکہ میراث کو بھی سامنے لاتی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

> ''صبح سویرے ہی سب کو پتہ چل گیا کہ نور پور کے پگ بندھ جوان رات بھر عورتوں اور بچوں کو کٹی ہوئی گاڑی سے اٹھا کر نور پور لاتے رہے ہیں۔ قاتلوں کی ماؤں بہنوں نے انہیں فوراً حفاظت میں لے لیا اور اپنے قاتلوں کو گھر سے نکال دیا۔ اب وہ ہر مرد کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتی تھیں۔
>
> ماسی اقبال نے اپنے سفید ریش میاں کی بہت بے عزتی کی، حالانکہ وہ تو مسجد سے نکلا بھی نہ تھا۔ اپنے دیور کو اس نے جوتیاں مار کر گھر سے نکال دیا جو بملا کو اٹھا کر لایا تھا۔۔۔ ماسی اقبال بملا کو سینے سے لگا کر بے تحاشا روئی پھر اس نے اپنے خاوند کی صورت پر تھوک دیا۔۔۔ مشتاق نے کہا: ''ماسی تم بملا کو میرے حوالے کر دو تم پر بوجھ ہو گی۔'' وہ بولی: ''میں اس کی خدمت خود کروں گی۔ اسے روٹی دوں گی چاہے میرے بچے بھوکے رہیں۔۔۔ وہ اللہ کی امانت ہے۔۔۔ تھوڑی دیر بعد چادر میں لپٹی بملا جب ماسی اقبال کے گھر سے نکلی تو گلی میں کہرام مچ گیا۔ ایک ایک عورت اسے گلے لگانے اور سینے سے چمٹانے لگی۔۔۔ آہ وزاری نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ ماسی اقبال پچھاڑیں کھا کھا کر گرنے اور زمین پر لوٹنے لگی۔ دھاڑیں مارتے اور دعائیں دیتے ہوئے اس کا گلا خشک ہو گیا۔ معافیاں مانگتے ہوئے عورتوں کی زبانیں خشک ہو گئیں۔ (۳)

مغربی پنجاب میں مسلمانوں کے ہاتھوں ہونے والے مظالم پر مسلمان عورتوں کے شدید ردِعمل کی مذکورہ مثال جیسی کئی مثالیں ''دل بھٹکے گا'' میں موجود ہیں تو ایک لمحے کے لیے ہی سہی، انسانیت کے کھوئے ہوئے شرف و وقار کی بازیافت کرتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ بیدی کے ''لاجونتی'' میں سندر لال بابو کے بعد ''دل بھٹکے گا'' کی مسلمان عورتیں وحشت اور خونی دور میں ناقابلِ یقین ہمدردی، خلوص اور مہرو

وفا کی دوسری بڑی مثال بن کر سامنے آتی ہیں۔

''دل بھٹکے گا'' میں فسادات کا حصہ کئی اعتبار سے نئے پن کو سامنے لاتا ہے اور ''آپ بیتی'' کا گمان نہیں گزرتا۔ آگے چل کر جب ''دل بھٹکے گا'' میں صحافتی زندگی اور ملک کے سیاسی نشیب و فراز سامنے آتے ہیں تو یہاں تخلیقی سرا احمد بشیر کے ہاتھ سے نکلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ احمد بشیر نے ''دل بھٹکے گا'' میں فسادات کے حصے کے علاوہ دیگر مقامات پر اپنی کتھا بیان کی ہے اور جس کا انداز ناول کی تخلیقی جہت سے مماثل محسوس نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے ''دل بھٹکے گا'' کو ناول کے طور پر دیکھنے میں قدرے دشواری کا سامنا ہوتا ہے۔

ممتاز مفتی کے دونوں ناولوں اور احمد بشیر کے ''دل بھٹکے گا'' میں فنی اور تخلیقی اعتبار سے نمایاں فرق یہ ہے کہ مفتی کے دونوں ناول احساس محرومی، توجہ طلبی، عقل و عشق کی معرکہ آرائی اور حسرتوں کو جاری و ساری رکھے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ مفتی کے دونوں ناول فرد کی باطنی کش مکش اور پیاس کو پوری زندگی پر بکھیرتے نظر آتے ہیں۔ ان ناولوں میں یہی قدر اور انداز بکھرے ہوئے نقوش کو یک جا رکھنے میں مدد دیتا ہے۔ احمد بشیر کے ''دل بھٹکے گا'' میں ایسی مثال نظر نہیں آتی۔ یہ کتاب مختلف ٹکڑوں میں منقسم ہے اور یہ ٹکڑے کسی بھی مقام یک جا کر کوئی ایک بڑی تصویر بنانے میں ناکام نظر آتے ہیں۔ یہی عنصر ''دل بھٹکے گا'' کو ناول کی نئی صورت بھی دینے میں کامیاب محسوس نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود اس کتاب کا پرذرّہ اپنی جگہ پر آفتاب سے کم نہیں۔ ''ناول لکھنے کی ترکیب'' کے عنوان سے احمد بشیر لکھتے ہیں:

> ''میرے پاس کوئی چکر دار پلاٹ نہیں۔ میرے کردار بھی میرے ساتھ دور تک نہیں چلتے۔ ادھر میں نے آنکھ جھپکی ادھر وہ گلیاروں میں گم ہو گئے، مگر کیا زندگی میں ایسا ہی نہیں ہوتا؟ کس نے زندگی پلاٹ کے مطابق گزاری۔'' (۴)

ہمارا خیال ہے کہ احمد بشیر کے کردار گلیاروں میں گم نہیں ہوئے۔ اس کا ثبوت ''دل بھٹکے گا'' سے بہتر کیا ہوگا۔ ساتھ رہنے والے کردار تو صرف اس لمحے گم ہوتے ہیں، جب انسان خود گم ہو جاتا ہے۔ اگرچہ ''دل بھٹکے گا'' کو ذہن فوری طور پر ناول کی حیثیت سے قبول کر لینے سے گریزاں ہے مگر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ناول نگاری کے نئے اسالیب، سانچے اور انداز ''دل بھٹکے گا'' کی صورت میں ہمارے دروازے پر دستک دے رہے ہوں۔ دروازے کی یہ زنجیر اب وقت ہی کھولے گا۔

حوالہ جات

۱۔ Freud, Sigmund: "Introductory Lecturer on Psychoanalysis" (Vol.1), edited by James Strachey, Pengiun Books, London, 1995, P.423۔

۲۔ احمد بشیر: ''دل بھٹکے گا''، فیروز سنز، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۳۳۳۔

۳۔ ایضا ص ۴۴-۳۴۳، ۳۵۵۔

۴۔ ایضا ص ۸۔

احمد ندیم تونسوی

ایکسٹیسی

(ECSTASY)

میں مر چکا ہوں۔ لیکن آپ کو یوں دکھائی دے رہا ہوگا جیسے میں لکھتے لکھتے میز پر سر ٹکا کے سو گیا ہوں۔ مجھے مرے ہوئے کتنا عرصہ ہو چکا ہے۔ ایک لمحہ، دو لمحے، ایک سال، ایک صدی یا اِس سے بھی کہیں زیادہ۔ مجھے نہیں معلوم۔ یا وقت رُک گیا ہے۔ میرے جسم سے بَدبُو بھی نہیں آ رہی شاید اس لیے کہ میں ابھی تک اپنے گرم لہو کی بوندوں کو اپنے پیروں پر محسوس کر رہا ہوں جو سادہ موسیقائی وقفے سے میرے پیروں پر گر رہی ہیں۔ کب سے گر رہی ہیں اور کب تک گرتی رہیں گی؟ ہو سکتا ہے یہ ایک ناختم ہونے والا تسلسل ہو؟ میرے پیروں پر گر کر گرم لہو کی بوندیں لفظ بن رہی ہیں۔ میں کمرے میں اُن کے قدموں کی چاپ سن رہا ہوں۔ ممکن ہے آپ یہ چاپ سننے سے قاصر ہوں۔

یہ دسمبر کے آخری دِنوں کی ایک سرد رات کا آخری پہر تھا۔ میں اس رات کہانی لکھنا چاہتا تھا۔ کہانی لکھنے کے لیے کہانی کا ہونا ضروری ہے اور کہانی کے لیے لفظوں کا ہونا۔ پچھلے کئی مہینوں سے میں کہانی نہ لکھ پایا تھا۔ سب لفظوں کا روٹھ جانا تھا۔ میں جتنے لفظ دن بھر اکٹھے کرتا، کہانی لکھتے وقت مجھ سے دور بھاگ جاتے۔ لفظوں کو سنبھال کر باندھ کر بھی تو نہیں رکھا جا سکتا۔ اگر آپ لیکھک ہیں تو میرا مسئلہ بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ جو لفظ آپ کی ملکیت ہے، ضروری نہیں کہ آنے والے لمحے میں بھی آپ کی ملکیت ہو۔ اگر لیکھک ایک خاص عرصے تک اپنے جمع شدہ الفاظ استعمال نہ کرے یا نہ کر سکے تو لیکھک مر بھی سکتا ہے اور کئی مر چکے ہیں۔ شاید KEATS بھی اِس لیے کم عمری میں مر گیا تھا کہ اُس کے پاس لفظ ختم ہو گئے تھے۔ میں نے یہ ممکن کوشش کی کہ لفظ مجھ سے نہ رُوٹھیں۔ مگر لفظوں نے شاید تہیہ کر رکھا تھا کہ مجھ سے دُور ہی رہیں گے۔ میں نے بے بسی کے عالم میں سگریٹ سلگایا اور کھڑکی کھول کر باہر جھانکا۔ باہر سنسان سڑک پر ہوا خزاں رسیدہ پتوں سے کھیل رہی تھی۔ شاید آپ کو یقین نہ آئے۔ لیکن وہ سب لفظ ہی تھے۔ اتنی تعداد میں کہ ایک قنوطی لیکھک بھی للچا جاتے سب کو اپنی ملکیت میں لینے کے لیے۔ میں نے غصے یا شکستگی کی وجہ سے کھڑکی بند کر دی۔

میرے کمرے میں لفظ ہی لفظ تھے مگر مجھ سے دُور۔ انگیٹھی پر، بک شیلف پر، سگریٹ کے پیکٹ پر، چھت سے لٹکتے ہوئے پنکھے پر، کمرے میں ٹہلتے ہوئے لفظ، باہم سرگوشیاں کرتے ہوئے لفظ۔

چند لمحے اور گذر گئے۔ میں نے اضطراری حالت میں ایک اور سگریٹ سلگایا تو کمرے میں قہقہہ بلند ہوا۔ قہقہے کا انداز جیسا بھی تھا مگر مجھے انتہائی ناگوار گذرا۔ میں نے چھوٹے سے کمرے میں قہقہے کا

مرکز تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ دوسرے قہقہے پر میرا سر فوراً گھوما۔ میرا محبوب قلم قہقہہ لگا رہا تھا۔ قلم بھی محبوب ہوسکتا ہے۔ بلکہ میرا قلم تو ایک مکمل محبوب تھا۔ تھا کیوں۔ اَب بھی ہے۔ میرے سینے کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ یہ خدنگ نما چینی قلم جو کہ بانس کی ایک سڈول شاخ کا بنا ہوا ہے میرے دوست نے مجھے چین سے واپسی پر تحفے میں دیا تھا۔ میں لکھنے کے لیے ہمیشہ روایتی قلم استعمال کرتا ہوں۔ جدید طرز کے قلم لفظ توڑ دیتے ہیں۔ لفظ انتہائی نازک ہوتے ہیں۔ لفظ اگر ٹوٹ جائیں یا روٹھ جائیں تو لیکھک پھر بیگار کا لیکھک رہ جاتا ہے۔ میں نے غصے سے قلم کو دیکھا تو قلم کا قہقہہ اُس کے حلق میں پھنس کے رِہ گیا۔ قہقہے کے دَم توڑتے ہی کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ سناٹے سے گھبرا کے میں نے کھڑکی کھولی تو ہوا اور خشک پتوں کے باہمی مِلاپ سے آنے والی آوازوں نے آختہ دماغ میں ہیجان پیدا کرنے کی کوشش کی مگر یہ کوشش بھی انتہائی موہوم تھی کہ ہیجان جلد ہی اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ میں نے شکستگی کے عالم میں کھڑکی بند کر دی۔ کھڑکی دیر تک لرزتی رہی اور کھڑکی پر بیٹھے ہوئے لفظ نیچے گر کر کونوں کھدروں میں گھس گئے۔ تب میں نے انگلیوں میں ختم ہوتے سگریٹ کی تپش محسوس کی۔ راکھدان میں سگریٹ مسلنے کے بعد میں نے ایک بار پھر قلم اٹھایا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے شاید بخار کی وجہ سے قلم کا پورا جسم لرز رہا ہو۔ میں نے بے ساختہ قلم کو واپس وہیں رکھ دیا۔

اب میرا سر آتش فشاں کی طرح لحظ لحظ پھٹ رہا تھا اور یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے سرد لاوا میرے پورے جسم میں بہہ رہا ہو اور لاوا اپنے ساتھ ٹنڈ منڈ الفاظ لیے پورے جسم میں کہیں سے حرارت حاصل کرنے کے لیے سفر کر رہا ہو۔ میرا وجود شال ہو کر کرسی میں گر پڑا اور پتہ نہیں کتنے لمحوں تک شل پڑا رہا تاوقتیکہ ایک قہقہے نے میری رگوں میں دوڑتے ہوئے سرد لاوے کو ساکن کر دیا۔ قہقہے نے سکون کو اور سکون نے سناٹے کو جنم دیا۔ اِس کے بعد ایک ایک اور قہقہہ۔

''ہوں۔۔۔ لفظ تلاش کرتے ہو۔ لفظ تو تم خود ہو۔ کیا خود کو تلاش کرتے ہو؟ تم تو ہمیشہ سے ہو اور ہمیشہ رہو گے۔ خود کو پالو گے تو لفظ مل جائیں گے۔ کہانی کے لیے لفظ ضروری نہیں۔ کہانی تو محسوس بھی کی جا سکتی ہے اور احساس کے لیے لفظوں کی قطعاً ضرورت نہیں ہوتی۔'' میں نے غصے سے قلم کو دیکھا اور اِس سے پہلے کہ میرا دایاں ہاتھ مکے کی شکل میں میز پر پڑتا قلم خاموش ہو گیا۔ میرا سارا وجود آہستہ آہستہ لرز رہا تھا اور جسم کے مساموں سے ٹھنڈا پسینہ بوندوں کی شکل میں بے معنی لفظ لیے میری کھال پہ بہہ رہا تھا۔ بے ساختہ میرے حلق سے چیخ برآمد ہوئی۔ مگر بغیر آواز کے۔ شاید اِس لیے کہ ہر آواز میں لفظ ہی ہوتے ہیں اور لفظ مجھ سے روٹھ گئے تھے۔ حتیٰ کہ میری چیخ سے بھی۔

تب میں نے کرسی سے اُٹھنے کی کوشش کی اور اِسی کوشش میں گر پڑا۔ کمرے میں قہقہے پھیل گئے چند لمحے فرش پر بے حس و حرکت پڑے رہنے کی بعد میں اپنے حواس جمع کر کے اُٹھا اور بک شیلف کی طرف گیا۔ اِس احسان کے ساتھ کہ کہیں میری پڑھنے کی صلاحیت ہی ختم نہ ہو گئی ہو ایک کتاب کو اٹھا کر کھولا تو

کتاب کے اوراق کو بالکل سفید پایا جیسے اُن پر کبھی بھی کوئی نقش نہ رہا ہو۔ میں نے دیوانگی کی کیفیت میں تمام کتابوں کو کھنگال ڈالا۔ مگر ساری کتابوں کے اوراق بالکل ہی بے نقش تھے۔

اب دیوانگی کی جگہ خوف نے طاری ہونا شروع کیا۔ کمرے میں بکھرے ہوئے سینکڑوں، ہزاروں بلکہ اِس سے بھی کہیں زیادہ لفظ کورس میں گا رہے تھے۔

''جو سوچتے ہو، جو سمجھتے ہو، وہی لکھو۔ سب لفظ تمہارے ہیں۔ سب لفظ تمہارے ہیں۔'' میں نے بے بسی سے قلم کی طرف دیکھا۔

''مجھے معلوم ہے تم یہ نہیں کر سکتے۔ مصلحت اب تمہاری عادت بن چکی ہے۔ مگر ایک راستہ اب بھی باقی ہے۔ پھر سارے لفظ تمہارے ہو جائیں گے۔

تب میں نے لفظوں کو اپنی ملکیت میں لینے کا تہیہ کر لیا۔ میرا دماغ لحظہ لحظہ آتش فشاں کی طرح پھٹ رہا تھا۔ انتہائی ناقابلِ برداشت اور گرم لاوا میرے پورے وجود میں دوڑنا شروع ہوا۔ جس سے آہستہ آہستہ جسم میں سرور ساطاری ہوتا گیا۔

قلم میرے ہاتھ میں تھا۔ قلم کی نوک آہستہ آہستہ میرے سینے کی بائیں طرف کی پسلیوں کے درمیان کھال چیرتی ہوئے میرے دل کی جانب بڑھ رہی تھی۔ جوں جوں قلم کی نوک دل کے نزدیک تر ہوتی جا رہی تھی۔ سرور و مستی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ قلم کی نوک نے دل کی دیوار کو چھوا تو آختہ دماغ نے افزائش الفاظ کا اعلان کیا۔ قلم کی نوک نے دل کی دیوار کو چیرا اور لفظ ابل پڑے۔ اتنے لفظ کہ کسی بھی لیکھک کا دل للچا جائے لیکن میں اب ان کا اکیلا مالک تھا۔ وہ سارے لفظ صرف میرے تھے اور بے شمار کہانیاں جن کا کبھی میں صرف تصور ہی کر سکتا تھا اب صرف میری تھیں۔ لفظوں کی خوشبو چار سو پھیل گئی اور اب جہاں جہاں لہو کی بوندیں گر رہی ہیں وہاں وہاں لفظ بن رہے ہیں، کہانیاں بن رہی ہیں اور میں کیف و مستی میں ڈوبا میز پر سر ٹکائے بیٹھا ہوں۔ جسے آپ مرا ہوا سمجھ رہے ہیں۔

☆☆☆

دلفینی دُومورئیر / ڈاکٹر شگفتہ حسین

بوڑھا آدمی

کیا میں نے آپ کو یہ کہتے سنا کہ آپ بوڑھے آدمی کے بارے میں پوچھ رہے تھے؟ میرا خیال ہے کہ ایسا ہی تھا۔ آپ یقیناً یہاں ضلع میں نووارد ہیں ___ چھٹیوں پر آئے ہوں گے، ہیں ناں! ویسے بھی گرمی کے مہینوں میں بہتیرے آپ جیسے یہاں آتے رہتے ہیں۔ بہرحال وہ ہمیشہ ڈھلوانی چٹانوں سے ہوتے ہوئے آخرکار سمندر کے اس کنارے کا راستہ تلاش کر لیتے ہیں اور پھر ___ وہ یہاں ایک پل کو ٹھہرتے ہیں اور آپ ہی کی طرح سمندر سے پلٹ کر جھیل کی طرف دیکھتے ہیں جیسا کہ ابھی آپ نے کیا۔

یہ بہت دلکش مقام ہے ___ ہے کہ نہیں؟ کیسا خاموش، پُرسکون اور سب سے الگ تھلگ!

آپ کو اب اس بات پر حیرت نہیں ہونی چاہیے کہ بوڑھے نے رہنے کے لیے اس جگہ کو چُنا۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ وہ یہاں کب آیا۔ ویسے کوئی بھی نہیں بتا سکتا۔ یقیناً برسوں پہلے آیا ہوگا، جنگ سے بھی بہت پہلے! میں جب اس جگہ پہنچا تو وہ پہلے سے یہاں موجود تھا۔ شاید وہ بھی میرے طرح مہذب لوگوں سے بچ کر یہاں آیا تھا یا شاید جہاں وہ پہلے رہتا تھا، وہاں جو لوگ اس کے اردگرد بستے تھے انہوں نے اسے اتنا تنگ کیا کہ اس کا جینا دوبھر کر دیا اور اسے مجبوراً یہاں آنا پڑا۔ بس کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ ابتدا ہی میں مجھے یوں محسوس ہوا کہ یا تو خود اس سے کوئی ایسی بات ہوئی ہے یا اس کے ساتھ کچھ ایسا سلوک ہوا ہے کہ اس کے دل میں دنیا کے خلاف کینہ پیدا ہو گیا ہے۔ مجھے یاد ہے جب پہلے دن میں نے اُسے دیکھا تو خود سے کہا ''میں شرط لگاتا ہوں کہ یہ بڈھا بندہ ایک زبردست کردار ہے۔''

ہاں تو بھئی وہ یہاں جھیل کے ساتھ اپنی بیگم کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ ایک پُرلطف انداز میں زندگی کا مزہ لیتے، تمام موسموں میں کھلے بندوں رہتے، لیکن ایسا لگتا جیسے انہیں کسی موسم کے سرد و گرم ہونے کی کوئی پرواہ نہ ہو۔ کھیتوں میں کام کرنے والے ایک شخص نے مجھے اس کے بارے میں خبردار کیا۔ اس نے مسکراتے ہوئے مجھے نصیحت کی کہ بوڑھا جو نیچے جھیل کنارے رہتا ہے میں اس کا رستہ تنگ نہ کروں اور اُسے کھلی مناسب جگہ دیئے رکھوں۔ یوں بھی وہ اجنبی لوگوں کی زیادہ پرواہ نہیں کرتا۔ چنانچہ مجھے جب بھی جھیل کنارے جانا ہوتا میں بڑی ہوشیاری سے جاتا اور کبھی بھی پورا دن گزارنے کے لیے وہاں ڈیرے ڈال کر نہ بیٹھتا۔ ویسے بھی وہاں رکنے کا کوئی فائدہ تو تھا نہیں کیونکہ میں اس کی زبان نہیں جانتا تھا۔ پہلی مرتبہ جب میں نے اُسے دیکھا تو وہ جھیل کنارے کھڑا تھا، سمندر کی طرف ٹکٹکی باندھے تکتے ہوئے۔ چنانچہ میں بڑے دھیان سے ندی کے اوپر رکھے تختے سے بچ کر گزرا اور اس کا مطلب یہ ہے جناب کہ میں بالکل اس کے قریب سے گزرا اور اس طرح ساحل کی بجائے جھیل کی دوسری طرف سے

ہوتے ہوئے پار اُتر گیا۔ پھر مجھے ایک کڈھب احساس ہوا کہ میں بڈھے کی دنیا میں بے جا مداخلت کا مرتکب ہو رہا ہوں اور یہاں تو میرا کوئی کام ہی نہیں، میں ایک دم سے زرد پھولوں کی جھاڑی کے پیچھے چلا گیا۔ جیب سے اپنی چھوٹی سی دوربین نکالی اور لگا اُسے تاکنے!!

وہ ایک شاندار بندہ تھا، چوڑا چکلا اور مضبوط ___ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اب وہ بوڑھا ہو گیا ہے، لیکن میں بھی تو کئی سال پہلے کی بات کر رہا ہوں ___ اب بھی اگر آپ اُسے دیکھیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ وہ اپنی جوانی میں کیسا شاندار رہا ہوگا۔ واہ! میں نے وہ زمانہ دیکھا ہے ___ اس کے پٹھوں میں کیسی طاقت، کیسا زور تھا، اور وہ اس کا وہ خوبصورت سر، جسے وہ کسی بادشاہ کی طرح بلند کیے رہتا۔ یہ جو ابھی میں نے بات کی ہے اس میں بھی ایک رمز ہے ___ نہیں بھئی، میں کوئی مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ اگر اس کے کسی دور پرے کے جدامجد کا کھوج لگایا جائے تو ___ تو کون جانتا ہے کہ اس کی رگوں میں کون سا شاہی خون دوڑ رہا ہے؟ اور اب اور تب، اس کی رگوں میں دوڑتے ہوئے ___ بھئی اس میں اس کا اپنا کوئی قصور نہیں ہے ___ یہ خون اس کی اچھائیوں پر غالب آ کر اُسے پاگلوں کی طرح لڑنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ لیکن صاحب جب میں نے پہلی مرتبہ اُسے دیکھا تھا تو تب میں نے یہ بات نہیں سوچی تھی۔ میں نے تو صرف اس کی طرف دیکھا اور جیسے ہی میں نے اُسے مڑتے دیکھا میں بڑی تیزی سے زرد پھولوں کی جھاڑی کے پیچھے دُبک گیا، میں حیران ہو رہا تھا کہ اس کے ذہن میں کیا بات آئی جو وہ میری طرف مُڑا، کیا اسے معلوم تھا کہ میں وہاں موجود ہوں اور اس پر نگاہ رکھے ہوئے ہوں۔

اگر اس نے میرے پیچھے جھیل کی اوپر کی سمت آنے کا فیصلہ کر لیا تو ___ اوہ خدایا میں کیسا احمق لگوں گا، لیکن یوں لگا کہ اس نے اس سے بہتر کوئی بات سوچی ہے یا شاید اس نے اس بات کی پرواہ ہی نہیں کی ___ بس وہ مرغابیوں اور آتی جاتی موجوں کو دیکھتے ایک ٹک سمندر کی اَور دیکھا کیا۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد وہ سُبک رفتاری سے چلتا جھیل کی اپنی سمت روانہ ہو گیا ___ اپنی بیگم اور اپنے گھر کی طرف ___ اور شاید دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے بھی۔

اس پہلے دن تو میں اس کی بیگم کی ایک جھلک بھی نہ دیکھ سکا کیونکہ وہ اس وقت وہاں نہیں تھی وہ جھیل کے بائیں کنارے کے بالکل ساتھ رہتے تھے۔ اس جگہ جانے کے لئے کوئی باقاعدہ راستہ نہیں بنا ہوا تھا جبکہ مجھ میں اتنی ہمت بھی نہ تھی کہ میں خطرناک حد تک ان کے قریب جاتا اور بیگم سے دوبدو ملتا، پھر جب میں نے اُسے دیکھا تو میں تو جناب بہت مایوس ہوا، وہ تو بالکل بھی اس قابل نہ تھی کہ اس کی طرف دیکھا بھی جاتا۔ میرا مطلب ہے کہ بیگم میں بوڑھے جیسی کوئی خوبی نہ تھی۔ ہاں میں نے یہ اندازہ لگایا کہ وہ نرم، حلیم اور معتدل مزاج مخلوق تھی۔

جب میں نے انہیں دوبارہ دیکھا تو وہ مچھلی کے شکار سے واپس آ چکے تھے اور ساحل کنارے سے جھیل کی طرف جا رہے تھے۔ وہ بڑے طمطراق سے آگے آگے چل رہا تھا اور بیگم ___ وہ تو بس اس کا

دم چھلا بنی پیچھے پیچھے روانہ تھی۔ بے نیازی کی انتہا دیکھو، دونوں میں سے ایک نے بھی ذرہ برابر جو میری طرف دیکھا ہو___ لیکن مجھے کیا___ میں تو خوش تھا، کیونکہ بہت ممکن ایسا ہے اور بھی ہوسکتا تھا کہ بڈھا ٹھہرتا، بیگم کا انتظار کرتا پھر اُسے کہتا کہ تم گھر واپس چلی جاؤ اور پھر ان چٹانوں کی طرف نیچے آتا جہاں میں چھپا بیٹھا انہیں تاک رہا تھا۔ آپ پوچھ رہے ہیں کہ اگر وہ ایسا کرتا تو میں اس سے کیا کہتا! مجھ پر خدا کی لعنت ہو اگر مجھے ذرا بھی اندازہ ہو کہ پھر میں کیا کہتا___ شاید میں اس کے آتے ہی اُٹھ کھڑا ہوتا، بے پروائی سے سیٹی بجاتا اور یہ ظاہر کرتا کہ مجھے اُن سے کوئی مطلب نہیں ہے، پھر اسی بے نیازی سے بڈھے کی جانب متوجہ ہوتا، سر کی جنبش اور ایک رسمی مسکراہٹ کے ساتھ___ کیا کہہ رہے ہیں جناب کیا یہ سب بیکار ہوتا___ واقعی بیکار تو ہوتا لیکن یہ سارا عمل خود بخود ہوتا، اگر آپ سمجھ سکیں جو میں سمجھانا چاہتا ہوں تو بس میں اُسے ایک اچھے دن کی دعا دیتا اور پھر آوارہ گردی کے لئے کہیں دور نکل جاتا اور وہ___ میں نہیں سمجھتا کہ جواب میں وہ کچھ کہتا، وہ بس پیچھے سے مجھے گھورتا رہتا۔ اپنی انہی حیرت انگیز گہری آنکھوں سے اور مجھے جانے دیتا!!

اس کے بعد تو پھر کیا سردیاں اور کیا گرمیاں، میں ہمیشہ نیچے سمندر کنارے ہوتا یا چٹانوں پر بیٹھا رہتا، دوسری طرف وہ اسی طرح زندگی گزارتے رہے___ اپنے مخصوص انوکھے اور جداگانہ طرزِ زندگی کے ساتھ___ کبھی وہ جھیل میں مچھلی کا شکار کرتے اور کبھی سمندر میں___ مدوجزر کے وقت، لنگر انداز کشتیوں اور جہازوں کا نظارہ کرتے سے، گاہے گاہے میرا ان دونوں سے بندرگاہ پر بھی آمنا سامنا ہو جاتا۔ میں انہیں وہاں دیکھتا تو اکثر حیران ہوتا کہ دونوں میں سے کس نے یہاں آنے کی صلاح دی ہوگی۔ شاید بندرگاہ کی زندگی اور ہل چل نے، یا شاید ان چیزوں نے جنہیں اس نے بلاوجہ ترک کر دیا تھا یا پھر وہ سب جس کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتا تھا، اپنی کشش سے اسے اچانک کھینچ بلایا ہو اور اس نے بیگم سے کہا ہو، ''آج ہم قصبے میں جا رہے ہیں'' اور وہ جو وہ سب کچھ خوشی خوشی کرتی ہے جو بڈھے کو اچھا لگے، سرِ تسلیم خم کئے اس کے پیچھے چل پڑی ہوگی۔

آپ نے دیکھا جناب ایک چیز جو نمایاں تھی___ اور جسے آپ توجہ دیئے بنا نہیں رہ سکتے___ یہ کہ یہ جوڑا ایک دوسرے کا بے حد وفادار تھا۔ میں نے بیگم کو دیکھا تھا کہ وہ اُسے پیچھے گھر چھوڑ جاتا اور دن بھر مچھلی کا شکار کر کے واپس آتا تو اس کا استقبال کرنے کے لئے وہ شام کے وقت جھیل سے نیچے سمندر کنارے آجاتی اور اس کا انتظار کرتی اور اُسے دور سے آتا دیکھتی رہتی۔ دوسری طرف میں بھی بڈھے کی آمد کا نظارہ کرتا۔ کھاڑی کے کونے سے چکر لگا کر آتے ہوئے وہ سیدھا سمندر کنارے آجاتا، تب وہ بھی اس سے ملنے کے لئے آگے بڑھ آتی اور پھر وہ دونوں ایک دوسرے سے لپٹ جاتے، یہ پرواہ کئے بنا کہ کوئی انہیں دیکھتا ہے یا نہیں۔ کیا بتاؤں جناب یہ منظر تو دل کو چھو لیتا تھا۔ اگر آپ سمجھ سکیں کہ میرا مطلب کیا ہے، تو میری طرح آپ بھی یہ محسوس کریں گے کہ اگر ان دونوں کے درمیان معاملات اس طرح سے تھے تو پھر وہ بڈھا کیسا قابلِ محبت تھا۔ ہوسکتا ہے کہ باہر سے آنے والوں کے لئے بڈھا شیطان سے کم نہ ہو

لیکن اس کے لئے تو اس کی کل کائنات وہی تھا۔ جب میں ان دونوں کو اس انداز سے اکٹھے دیکھتا تو یہ محبت بھرا منظر میرے اندر بڈھے کے لئے گرم جوشی کے جذبات پیدا کر دیتا۔

ہاں صاحب آپ نے پوچھا کہ کیا ان کی کوئی اولاد تھی! تو بس میں بھی اسی طرف آرہا تھا۔ دراصل میں اِن کی اولاد ہی کے بارے میں تو آپ کو بتانا چاہتا تھا کیونکہ کیا آپ کو معلوم ہے کہ یہاں ایک المناک واقعہ بھی رونما ہوا تھا اور میرے سوا اس کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں کسی کو بتا تو سکتا تھا، لیکن اگر میں نے بتا دیا ہوتا تو___ مجھے نہیں معلوم___! ہوسکتا ہے کہ لوگ بڈھے کو پکڑ کر لے جاتے اور اس کے بغیر بیگم کا دل ٹوٹ جاتا، بہر حال جب سب کہہ دیا گیا اور سب ختم ہو چکا تو پھر یہ میری ذمہ داری نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ بوڑھے کے خلاف گواہی بہت مضبوط تھی لیکن کیا کیا جائے میرے پاس کوئی قطعی ثبوت نہیں تھا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کوئی حادثہ پیش آ گیا ہو؟ جب لڑکا غائب ہوا تو تب کسی نے کوئی تفتیش بھی تو نہیں کی تھی___ تو پھر بھئی میں کون ہوتا تھا خدائی فوجدار اور مخبر بننے والا___ ٹھیک ہے ناں؟؟

میں کوشش کروں گا کہ جو کچھ ہوا اُسے حرف بہ حرف بیان کر دوں لیکن جناب آپ یہ بات اچھی طرح سمجھ لیں کہ جو واقعہ میں بیان کرنے جا رہا ہوں یہ کچھ عرصہ پہلے رونما ہوا تھا اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ میں گھر سے دور ہوتا تھا یا بہت مصروف، تو ایسے میں جھیل کے قریب بھی نہ جا سکتا۔ مجھے تو ایسا لگتا تھا جیسے میرے علاوہ کوئی بھی وہاں رہنے والے جوڑے میں دل چسپی نہیں رکھتا تھا؛ چنانچہ یہ صرف وہی کچھ ہے جو میری آنکھوں نے دیکھا، اس سے یہ ساری کہانی تشکیل پائی ہے؛ میں نے کسی اور سے کوئی بات نہیں سنی اور نہ ہی یہ کوئی افواہ یا گپ ہے، یا کوئی ایسی کہانی جو ان کی پیٹھ پیچھے سنائی گئی ہو!

ہاں تو جناب میں کہہ رہا تھا کہ وہ ہمیشہ ایسے تنہا نہ ہوتے تھے جیسے اب ہیں۔ ان کے چار بچے تھے، تین لڑکیاں اور ایک لڑکا۔ انہوں نے ان چاروں کی پرورش جھیل کنارے اسی پرانی اور غیر محفوظ، بودی جگہ پر ہی کی اور مجھے ہمیشہ اس بات پر حیرت ہوتی تھی کہ انہوں نے ایسا کیسے کیا؟ اوہ خدایا! میں ان دنوں کے بارے میں بھی جانتا ہوں جب موسلا دھار بارش کی بوچھاڑ جھیل کو چھوٹی چھوٹی موجوں میں بدل دیتی، پھر یہ موجیں بپھر جاتیں اور ان کے گھر کے قریب کیچڑ بھرے ساحل پر گھسی چلی جاتیں، یوں وہ اس کیچڑ کو دلدل بنا دیتیں اور رہی تیز ہوا___ تو وہ بھی درانہ وار سیدھی ان کے گھر میں گھستی جاتی تھی۔ آپ سوچیں گے کہ اگر حالات ایسے ہوں تو جس کے پاس ذرا سی بھی عقل ہوگی وہ اپنے بیوی بچوں کو یہاں سے نکال کر کہیں اور لے جائے گا، جہاں انہیں کم از کم اچھا رہن سہن، اچھا کھانا، کپڑا تو ملے گا، لیکن مجھے معلوم ہے کہ بڈھے نے___ ارے توبہ کرو بڈھے نے ایسا کبھی نہیں کرنا تھا۔ میرا اندازہ ہے کہ اس نے یہ طے کر رکھا تھا کہ اگر وہ یہ مشکلات برداشت کر سکتا ہے تو وہ بھی یہ سب جھیل سکتی ہے، رہے بچے تو اُسے ان سے بھی یہی توقع تھی۔ شاید وہ انہیں مضبوط بنانے کے لئے اس کٹھن طریقے سے پرورش کرنا چاہتا تھا۔

دھیان میں رکھنا جناب وہ پرکشش ننھے بچے تھے۔ خاص طور پر سب سے چھوٹی بچی۔ میں اس

کا نام تو کبھی نہ جان سکا لیکن میں اُسے ننھی کہہ کر پکارتا تھا اور بھئی وہ تھی بھی ایسی ہی پیاری سی، اس لئے اُسے یہ نام خوب ہی جچتا تھا لیکن اپنی ننھی جسامت کے باوجود وہ اپنے باپ پر گئی تھی۔ اب بھی میں اُسے اپنے تصور میں دیکھ سکتا ہوں۔ ایسی چھوٹی سی ننھی سی چیز___ ایک عمدہ صبح جھیل کے پانی میں کھیلنے کی جسارت سب سے پہلے اُسی نے کی۔ اپنی بہنوں اور بھائی___ سب سے آگے آگے وہ ہی تو تھی!

بھائی کا نام___ فرض کر لیجئے اس کا نام میں نے ''لڑکا'' رکھا تھا۔ وہ سب سے بڑا تھا، لیکن بس اس بات کو اپنے تک ہی رکھئے گا، وہ ذرا بیوقوف سا تھا۔ وہ اپنی بہنوں جیسا خوش شکل یا خوبصورت بھی نہ تھا، عجیب قسم کا بے ڈھنگا اور بے ڈول___ واقعی عجیب سا تھا وہ! لڑکیاں آپس میں کھیلتی رہتیں، کبھی مچھلی کے شکار کو بھی چلی جاتیں جبکہ وہ پیچھے اِدھر اُدھر ڈولتا پھرتا، یہ جانے بنا کہ اُسے اپنے تئیں کیا کرنا ہے۔ اب میں کیا بتاؤں، اس کے لئے تو اگر ممکن ہوتا تو وہ اپنی ماں کے قریب گھر میں بیٹھا رہتا کبھی باہر نہ نکلتا___ یہ نہ سمجھئے گا جناب کہ ماں اس پر دوسروں کی نسبت زیادہ توجہ دیتی تھی۔ جہاں تک میں بتا سکتا ہوں وہ تو چاروں سے ایک ہی جیسا سلوک روا رکھتی تھی بلکہ سچ پوچھیں تو بچوں کے بجائے وہ بڈھے کو زیادہ توجہ دیتی تھی وہ تو ان کے بجائے ہمیشہ اسی کے بارے میں سوچتی رہتی لیکن لڑکا، یوں کہہ لیجئے کہ ایک بڑا بچہ تھا اور میرا اندازہ ہے کہ وہ مزاج کا سادہ تھا۔

اپنے ماں باپ کی طرح بچے بھی اپنے تئیں مست و مگن رہتے تھے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ بڈھے نے کہہ کہہ کر ان کے دماغوں میں ٹھونس رکھا تھا کہ کسی کو قریب نہ آنے دو۔ وہ کبھی بھی نیچے ساحل سمندر پر کھیلنے کے لئے نہ آتے؛ میں سوچا کرتا کہ جب گرمیوں کے عروج میں لوگ ڈھلوانی چٹانوں سے نیچے ساحل پر آتے، نہاتے اور پکنک مناتے تو ان بچوں کے لئے یقیناً یہ بات خاصی پُرتحریص اور پُرترغیب ہوتی ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ بڈھا خود ہی جانتا ہوگا کہ وہ کون سی عجیب و غریب وجوہات ہیں جن کی بناء پر اس نے انہیں سختی سے تنبیہہ کر رکھی تھی کہ اجنبیوں سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں رکھنا ہے۔

بہرحال وہ میری آوارہ گردی کے عادی ہو گئے تھے۔ باقاعدگی سے آنا جانا، پانی میں بہتی لکڑیاں چننا اور اس طرح کے دوسرے کام انجام دینا میرا روزمرہ تھا۔ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ میں وہاں رک جاتا اور جھیل کنارے بچوں کو طرح طرح کے کھیل کھیلتے دیکھتا رہتا لیکن میں ان سے کوئی بات نہ کرتا، مبادا وہ فوراً گھر جاتے اور بڈھے سے میری شکایت کر دیتے لیکن جناب اتنا ضرور تھا کہ جب میں ان کے قریب سے گزرتا تو وہ عادتاً میری طرف سر اُٹھا کر دیکھتے اور پھر بے نیازی سے گردنیں موڑ کر دوسری طرف دیکھتے لگتے۔ مجھے تو یوں لگتا کہ وہ سب شرما جاتے تھے، سوائے ننھی کے۔ ننھی تو مجھے دیکھ کر، اترائے گی، صرف مجھے دکھانے کو، گردن کو ایک جھٹکا دے گی اور پھر ایک قلابازی لگائے گی، واہ بھئی ننھی واہ!!

کبھی کبھی میں انہیں کھلے سمندر میں دن بھر مچھلیاں پکڑنے کے لئے جاتے دیکھتا، چھ کے چھ اکٹھے___ بڈھا، بیگم، لڑکا اور تینوں لڑکیاں۔ بڈھا___ بلاشبہ ان کا انچارج ہوتا، ننھی مدد کرنے کے شوق

میں، اپنے بابا کے ساتھ ساتھ، بیگم اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہ کیا موسم خوشگوار اور عمدہ رہے گا؛ دوسری دونوں لڑکیاں اس کے ہمراہ؛ اور لڑکا، بیچارہ سادہ لوح لڑکا، ہمیشہ سب سے آخری ہوتا، جو گھر سے روانہ ہوتا۔ مجھے کبھی معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کیا تفریح کرتے تھے۔ وہ دیر تک گھر سے باہر رہنے کے عادی تھے اور میرا مسئلہ یہ تھا کہ مجھے ان کے دوبارہ واپس آنے تک ساحل سمندر سے روانہ ہو جانا ہوتا تھا لیکن میرا اندازہ تھا کہ وہ اپنی تفریح سے خوب لطف اندوز ہوتے تھے لیکن وہ بڑے قناعت پسند تھے جو میسر تھا اسی پر اکتفا کرتے زندگی گزار رہے تھے۔ ہاں صاحب، جانتا ہوں، مچھلی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ وٹامن سے بھرپور ہوتی ہے، ہوتی ہے کہ نہیں؟___ شاید بڈھا کھانے کے بارے میں بھی، دوسرے معاملات کی طرح خبطی تھا۔

وقت گزرتا رہا اور ننھے بچے بڑے ہوتے گئے۔ مجھے یوں لگا جیسے تب بڑے ہو کر ننھی نے اپنی انفرادیت کچھ کھو دی ہے۔ وہ بیشتر اپنی بہنوں جیسی ہی ہو گئی تھی۔ وہ ساری کی ساری ایک خوبصورت Trio میں ڈھل گئی تھیں۔ جانتے ہیں کیسی؟___ بڑی پرسکون، بہت مہذب لیکن جناب جہاں تک لڑکے کا تعلق ہے، تو وہ غیر معمولی طور پر عظیم الجثہ تھا۔ تقریباً بڈھے جتنا ہی بڑا، لیکن واہ بھئی کیسے فرق کے ساتھ! نہ تو وہ باپ جیسا خوبصورت تھا نہ طاقت ور اور نہ اس جیسی شخصیت تھی، وہ ایسا تو جناب بالکل بھی نہ تھا، بس صرف ایک بے ڈھنگا، بے ڈول گنوار تھا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ بڈھا اس کی وجہ سے شرمندگی محسوس کرتا تھا اور مصیبت یہ تھی کہ وہ گھر میں بھی کوئی زور نہیں لگاتا تھا جبکہ باہر مچھلی کے شکار کے لئے تو وہ یقیناً مکمل بیکار تھا۔ لڑکیاں بھنوروں کی طرح کام کرتی پھرتیں اور لڑکا، وہ ہمیشہ پیچھے پیچھے ہوتا اور پھر سارے کاموں کو چوپٹ کر کے رکھ دیتا۔ ایسے میں اگر اس کی ماں وہاں ہوتی تو وہ صرف اس کے ساتھ ساتھ چپکا پھرتا۔

میں واضح طور پر محسوس کرتا تھا کہ بڈھے کو یہ بات مضطرب کر دیتی تھی کہ اس کا بیٹا گنوار اور ناقص العقل ہے اور یقیناً اُسے شدید غصہ بھی آتا تھا کیونکہ لڑکا خاصے بڑے جثے کا تھا۔ بہت ممکن ہے بڈھے کے متعصب دماغ کے پلے یہ بات نہ پڑتی ہو کہ طاقت اور حماقت کا کوئی میل نہیں ہو سکتا تھا۔ بلاشبہ اگر یہ لڑکا کسی بھی عام خاندان کا فرد ہوتا تو روایت کے مطابق اپنے پیروں پر کھڑا ہو چکا ہوتا۔ میں اکثر سوچا کرتا کہ کیا بیگم اور بڈھا، دونوں شام کے وقت اپنے گھر میں بیٹھ کر اس مسئلے پر بحث کرتے ہوں گے یا پھر یہ کچھ ایسی بات تھی جو انہوں نے ایک دوسرے کے سامنے تسلیم تو نہ کی ہو لیکن بڑی حکمت سے سمجھ لی ہو کہ لڑکا کسی کام کا نہ تھا۔ اچھا جناب آخر کار ایسا ہوا کہ بچوں نے گھر چھوڑ دیا، کم از کم لڑکیوں نے تو! میں آپ کو بتاتا ہوں کہ یہ سب کیسے ہوا۔

یہ پچھلی خزاں کا ایک دن تھا، میں اتفاق سے بندرگاہ سے اوپر واقع چھوٹے سے قصبے میں جو اس جگہ سے تین میل پرے ہے، کچھ خریداری کر رہا تھا کہ اچانک میں نے دیکھا، بڈھا، بیگم، تینوں لڑکیاں اور لڑکا، سب کے سب پونٹ کی طرف جا رہے تھے۔ پونٹ دراصل ایک کھاڑی کے سرے پر واقع ہے جو بندرگاہ کی مشرقی سمت جاتی ہے۔ پونٹ میں صرف چند ایک چھوٹے چھوٹے سے گھر ہیں، ایک فارم ہے

اور اُوپر پیچھے کی طرف ایک چرچ ہے۔ بچے، دھلے دھلائے بنے ٹھنے تھے اور آج تو بڈھا اور بیگم بھی خوب سجے سنورے تھے۔ میں حیران تھا کہ کیا یہ کسی کو ملنے جا رہے ہیں اور اگر وہ ملنے جا رہے تھے تو ان کا ایسا کرنا ایک غیر معمولی امر تھا لیکن یہ بھی تو ممکن تھا کہ وہاں کہیں ان کے دوست یا شناسا رہتے ہوں، جن کے بارے میں مَیں کچھ نہیں جانتا تھا۔ بہرحال یہ آخری موقع تھا کہ ہفتے کی ایک عمدہ دوپہر کو میں نے انہیں اکٹھے پونٹ کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔

ہفتے کے اختتام پر شدید تیز ہوا چلی، صحیح معنوں میں مشرقی تند و تیز طوفانی ہوا! میں اس طوفان میں گھر میں بند بیٹھا رہا اور ایک لمحے کے لیے بھی باہر نہ نکلا۔ میں جانتا تھا کہ باہر سمندری موجیں سر پٹخ رہی ہوں گی اور سمندر کنارے جانا ناممکن ہوگا۔ لیکن میں حیران سوچ رہا تھا کہ اس طوفانی ہوا کے جھکڑوں میں بڈھا اور اس کے گھر والے گھر واپس آ سکے ہوں گے؟ اگر پونٹ میں ان کے دوست ہوں تو عقل مندی تو یہی تھی کہ وہ اپنے دوستوں کے ہاں ٹھہر جائیں۔

یہ منگل کا دن تھا جب ہوا کا زور ٹوٹا اور میں دوبارہ نیچے سمندر کنارے گیا۔ سمندری گھاس، پانی میں تیر کر آئی ہوئی لکڑیاں، تارکول اور تیل ساری جگہ پھیلا ہوا تھا۔ تیز مشرقی ہوا کے بعد ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ میں نے جھیل کی طرف اور بڈھے کے معمولی گھر کی طرف دیکھا۔ اور جاتنے ہیں صاحب میں نے اُسے وہاں دیکھا وہ جھیل کنارے بیگم کے ساتھ موجود تھا۔ لیکن وہاں بچوں کا کوئی نام ونشان نہ تھا۔

مجھے کچھ عجیب سا محسوس ہوا، میں تھوڑی دیر تو انتظار کرتا رہا کہ شاید ابھی وہ گھر سے باہر آئیں، لیکن اب نہ تب، وہ کبھی سامنے نہ آئے۔ میں جھیل کے گرد گھوم کر چلتا گیا یہاں تک کہ مخالف کنارے سے مجھے ان کے گھر کا بہتر نظارہ دیکھنے کو ملا۔ میں نے اپنی چھوٹی سی دوربین نکالی تا کہ انہیں زیادہ قریب سے دیکھ سکوں۔ لیکن جناب بس بچے وہاں نہیں تھے۔ بڈھا یونہی اِدھر اُدھر اچھلتا پھر رہا تھا۔ اکثر جب وہ مچھلیوں کا شکار نہ کر رہا ہوتا تو ایسا ہی کیا کرتا تھا یہ اس کی پرانی عادت تھی اور رہی بیگم تو وہ مزے سے دھوپ سینکنے کے لیے آرام سے بیٹھی ہوئی تھی ___ بے فکر اور بے پرواہ۔ اس ساری صورتِ حال کی صرف ایک ہی وضاحت ہو سکتی تھی کہ وہ چھٹیاں گزارنے بچوں کو پونٹ میں اپنے دوستوں کے پاس چھوڑ آئے تھے۔

اب آپ سے کیا چھپانا، میں یہ مانے بغیر نہیں رہ سکتا کہ میں مطمئن ہو گیا کیونکہ خوفزدہ کر دینے والے صرف ایک لمحے میں، میں نے سوچا تھا کہ جب ہفتہ کی رات یہ لوگ گھر واپس آنے کے لیے روانہ ہوئے ہوں گے تو طوفانی ہوا نے انہیں آ لیا ہوگا اور ہاں یہ بھی کہ ___ بڈھا اور بیگم تو حفاظت سے واپس پہنچ گئے لیکن بچے طوفان کا شکار ہو گئے ہوں گے۔ اگرچہ میں جانتا تھا کہ ایسا ممکن نہ تھا۔ میں نے کچھ تو سنا ہوتا، اس حادثے کے بارے میں، یا کسی نے کچھ تو بتایا ہوتا۔ یوں بھی اگر ایسا ہوا ہوتا تو بڈھا اپنے معمول کے بے فکرے انداز میں اچھل کود نہ کر رہا ہوتا اور بیگم بیٹھی دھوپ نہ سینک رہی ہوتی۔ صحیح، بالکل یہی بات ہوگی۔ وہ یقیناً بچوں کو اپنے دوستوں کے ہاں چھوڑ آئے تھے، یا پھر لڑکیاں اور لڑکا، کہیں دور دیہات کی طرف نکل گئے

ہوں گے۔ آخر کار ایسا ہو ہی گیا کہ وہ اپنا بوجھ اٹھانے کو نوکری کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے، ٹھیک؟!

بہرحال بچوں کے نہ ہونے سے ایک خلا سا پیدا ہو گیا۔ میں اُداس ہو گیا تھا۔ کیونکہ ایک عرصے سے مجھے ان سب کو اکٹھا دیکھنے کی عادت ہو گئی تھی ___ یعنی ننھی اور دوسرے سب اکٹھے! نہ جانے کیوں مجھے عجیب قسم کا احساس ہو رہا تھا کہ وہ ہمیشہ کے لیے مجھ سے بچھڑ گئے ہیں ___ میرا یہ احساس ___ قطعی احمقانہ تھا ___ تھا کہ نہیں؟؟ چھوٹے بچے، جنہیں میں نے اپنے سامنے پروان چڑھتے بڑے ہوتے دیکھا تھا اور اب ___ اب وہ بچے کہیں چلے گئے تھے ___ مگر کہاں؟؟؟

میں نے تب شدت سے خواہش کی کہ مجھے بڈھے کی زبان کے ایک یا دو لفظ آتے ہوتے تو میں اُسے کسی جانے پہچانے پڑوسی کی طرح، گھر کے باہر سے پکارتا اور کہتا، ''ہاں بھئی، کہو کیسے ہو؟ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم اور بیگم ایک دوسرے کے ساتھ مصروف ہو، بچے نظر نہیں آ رہے، یقیناً کوئی گڑبڑ نہیں ہے، کیا خیال ہے؟؟'' لیکن میں جانتا تھا کہ ایسے پوچھنے کا یہاں کوئی فائدہ نہ تھا۔ اگر میں ایسا کرتا بھی تو وہ اپنی اجنبی عجیب آنکھوں سے مجھے دیکھتا اور کہتا کہ میں جہنم میں جاؤں!

بس جناب میں نے لڑکیوں کو دوبارہ پھر کبھی نہ دیکھا ___ نہ کبھی نہیں۔ وہ کبھی لوٹ کر واپس نہ آئیں۔ ایک مرتبہ مجھے یوں لگا جیسے میں نے ننھی کو دیکھا ہے، بڑے دریا کے دہانے پر، دوستوں کے ایک گروپ کے ساتھ، لیکن میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ اگر ایسا تھا تو وہ خاصی بڑی ہو گئی تھی اور پہلے سے مختلف دکھائی دیتی تھی۔ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ میں کیا سوچتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ بڈھا اور بیگم اک اختتامی پروگرام کو سامنے رکھتے ہوئے، اس پچھلے ہفتے کو بچوں کو اپنے ہمراہ لے گئے تھے، اور یا تو انہوں نے انہیں اپنے جانے مانے دوستوں کے ساتھ سکونت پذیر کر دیا تھا یا پھر انہیں سمجھا دیا تھا کہ اب وہ بڑے ہو گئے ہیں اس لیے اپنا بوجھ خود اٹھائیں۔

میں جانتا ہوں کہ آپ کو میری بات پر یقین نہیں آ رہا کہ ایسا ممکن نہیں تھا اور آپ اپنے بچوں کے لیے ایسا کبھی نہ کرتے، لیکن یہ بات آپ کے دھیان میں رہے کہ بڈھا بڑا ضدی بندہ تھا، وہ اپنی ذات میں قانون تھا۔ بلاشبہ اس نے سوچا ہوگا کہ ان کے لیے یہی بہتر ہے اور ایسا قطعی ممکن تھا، لیکن جناب اگر مجھے یقینی طور پر یہ معلوم ہو جائے کہ لڑکیوں کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا، خاص طور پر ننھی کے ساتھ، تو میں، یقین جانیں ___ بالکل بھی فکرمند نہ ہوں گا۔

لیکن کیا کروں میں کبھی کبھی فکرمند ہو جاتا ہوں کیونکہ جو واقعہ لڑکے کے ساتھ پیش آیا وہ مجھے پریشان کر دیتا ہے۔ آپ خود دیکھیں، لڑکا کتنا بیوقوف تھا کہ گھر واپس آ گیا۔ وہ اس آخری ہفتے سے تقریباً تین ہفتے بعد واپس لوٹا۔ میں جنگل میں سے گزر رہا تھا ___ آپ جانیں یہ میرا معمول کا راستہ نہیں ___ جھیل کی اترائی میں ندی کے ساتھ ساتھ ___ ندی جو جھیل کو بڑے پیمانے پر پانی فراہم کرتی ہے ___ میں جھیل سے گھوم کر دلدل سے ہوتا ہوا بڈھے کے گھر سے کچھ فاصلے پر شمال کی طرف آیا، اور جو پہلی چیز میں

نے وہاں دیکھی وہ لڑکا تھا۔

وہ کچھ نہیں کر رہا تھا، بس دلدل کے پاس کھڑا تھا۔ وہ پریشان اور بدحواس دکھائی دیتا تھا۔ وہ مجھ سے بہت دُور تھا اور نہ میں اُسے پکار کر خوش آمدید تو ضرور کہتا، لیکن سچ یہ ہے کہ مجھ میں ایسا کرنے کی ہمت قطعی نہ تھی۔ پھر بھی میں اسے دیکھتا رہا۔ وہ اپنے اسی بے ڈھنگے گنواروں والے انداز میں وہاں کھڑا تھا اور میں نے دیکھا کہ وہ جھیل کے آخری سرے پر دُور کسی چیز کو ٹکٹکی باندھے دیکھے جا رہا تھا، معلوم ہے کسے؟ بوڑھے آدمی کو! بیگم اس کے ساتھ تھی لیکن انہوں نے لڑکے کا ذرہ برابر بھی نوٹس نہیں لیا۔ وہ سمندر کنارے کے قریب تھے، تختوں کے بنے پل کے ساتھ اور یا تو بالکل ابھی باہر مچھلی کے شکار کو جا رہے تھے، یا پھر واپس آ رہے تھے اور وہاں ___ لڑکا موجود تھا۔ اپنے حماقت زدہ چہرے کے ساتھ، نہ صرف حماقت زدہ بلکہ خوفزدہ بھی!!!

میں کہنا چاہتا تھا، ''کیا کوئی مسئلہ ہو گیا ہے؟'' لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ کیسے کہوں۔ میں بھی وہاں کھڑا رہا، لڑکے ہی کی طرح، بوڑھے کو ایک ٹک دیکھتے ہوئے۔

تب ہم دونوں کو جس بات کا خوف تھا کہ واقع ہو جائے گی، وقوع پذیر ہو گئی۔ بڈھے نے اپنا سر اٹھایا اور لڑکے کو دیکھا۔

اس نے یقیناً اپنی بیگم سے کچھ کہا ہو گا، کیونکہ اس نے کوئی حرکت نہیں کی اور جہاں تھی وہیں پل کے ساتھ رکی رہی، لیکن بڈھا ___ اُف خدایا! آسمانی بجلی کی سی تیزی سے مڑا اور جھیل کی دوسری سمت سے دلدل کی طرف نیچے لڑکے کی طرف آیا۔ وہ انتہائی خوفناک دکھائی دے رہا تھا۔ میں اس کے اس انداز سے نمودار ہونے کا منظر کبھی فراموش نہ کر سکوں گا۔ وہ شاندار سرجسے میں نے ہمیشہ سراہا تھا اس لمحے خفا تھا، شیطانی بلا تھا اور صاحب وہ لڑکے کو گالیاں دے رہا تھا، میں آپ سے سچ کہہ رہا ہوں کہ میں نے واقعی اُسے ایسا کہتے سنا۔

لڑکا حیران اور خوفزدہ تھا، مایوسی سے اُس نے اپنے اردگرد پناہ کے لئے دیکھا لیکن وہاں ایسا کچھ نہ تھا سوائے باریک سرکنڈوں کے، جو دلدل کے ساتھ ساتھ اُگے ہوئے تھے لیکن وہ بچارا ایسا سٹ پٹایا کہ ان میں چھپنے کے لئے چلا گیا اور وہاں جا کر دُبک گیا اور یقین کر لیا کہ وہ محفوظ ہو گیا ہے۔ افوہ! یہ انتہائی خوفناک منظر تھا۔

میں ابھی اپنی ہمت مجتمع کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ مداخلت کروں، جب اچانک بڈھا راستے میں ہی رک گیا، بس جہاں تھا وہیں تھم گیا اور پھر، مستقل کوستے گالیاں بکتے، بُڑبُڑاتے ہوئے واپس مڑا اور پل کی طرف چلا گیا۔ لڑکا اپنی سرکنڈوں کی پناہ گاہ سے اسے غور سے دیکھتا رہا، پھر احمق، تھوبے کا تھوبا ___ مانیئے کہ وہ یہی تھا ___ کچھ سوچتے ہوئے دوبارہ دلدل کی طرف جانے کے لئے باہر نکل آیا۔ میرا خیال ہے کہ وہ گھر کی طرف واپس جا رہا تھا۔

میں نے اپنے اردگرد دیکھا وہاں کوئی نہ تھا جسے مدد کے لئے پکارا جاتا اور اگر میں فارم پر جا کر کسی کو مدد کے لئے کہتا تو وہ یقیناً مجھ سے یہی کہتے کہ میں اپنے کام سے کام رکھوں اور یہ بھی کہ جب بڈھا

غصے میں ہو تو بہتر یہی ہے کہ اُسے تنہا چھوڑ دیا جائے۔ بہرحال لڑکا اب اتنا بڑا تو تھا کہ اپنا خیال رکھ سکے۔ وہ اتنا ہی لمبا چوڑا تھا جتنا بڈھا اور جو سلوک اس سے کیا جاتا وہ اس کا بہتر لوٹا سکتا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ معاملہ اس کے برعکس تھا۔ لڑکا، لڑائی بھڑائی والا نہیں تھا، وہ تو شاید جانتا ہی نہ تھا کہ کیسے لڑتے ہیں۔

میں کافی دیر تک جھیل کنارے انتظار کرتا رہا لیکن کچھ نہ ہوا۔ آہستہ آہستہ اندھیرا چھانے لگا۔ اب میرے یہاں انتظار کرنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ بڈھا اور بیگم پل سے ہوتے ہوئے اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئے تھے اور لڑکا ___ وہ ابھی تک جھیل کنارے دلدل پر کھڑا تھا۔

میں نے اُسے آہستگی اور نرمی سے پکارا، ''اس کا کوئی فائدہ نہیں، وہ تمہیں اندر آنے نہیں دے گا۔ پونٹ واپس چلے جاؤ، یا جہاں کہیں بھی تم اب تک تھے۔ کسی جگہ چلے جاؤ، کہیں بھی، لیکن یہاں سے نکل جاؤ۔''

اس نے سر اُٹھا کر اوپر دیکھا، وہی عجیب وغریب لیکن پریشان کن تاثر اس کے چہرے پر تھا اور میں بتا سکتا تھا کہ میرا ایک لفظ بھی اس کے پلے نہیں پڑا تھا۔

میں کچھ کرنا چاہتا تھا لیکن میں خود کو بے اختیار اور مجبور محسوس کر رہا تھا چنانچہ میں خود بھی گھر چلا آیا لیکن ساری شام میں لڑکے کے بارے میں ہی سوچتا رہا اور اس بے چینی میں صبح ہوتے ہی دوبارہ نیچے جھیل کی طرف آ گیا۔ آج میں نے ایک بڑی سی چھڑی بھی ہاتھ میں لے لی تھی تاکہ مجھے کچھ حوصلہ رہے۔ ظاہر ہے یہ کچھ اچھی بات نہیں تھی لیکن یہ بات بڈھے کے خلاف بھی نہ جاتی تھی۔ اچھا تو بھئی ___ پھر یوں ہوا کہ رات ہی رات میں وہ کسی ایک معاہدے پر متفق ہو گئے کیونکہ لڑکا حسبِ عادت اپنی ماں کے ساتھ چپکا وہاں موجود تھا جبکہ بڈھا اِدھر اُدھر اُچھلتا پھر رہا تھا۔

میں یقین سے کہتا ہوں کہ یہ صورتِ حال اطمینان بخش تھی کیونکہ جو کچھ بھی ہوا تھا، میں اس کے بارے میں کیا کہہ سکتا تھا اور کیا کر سکتا تھا؟ دیکھئے صاحب اگر بڈھا لڑکے کو گھر میں رکھنے کو راضی نہیں تھا، تو یہ اس کا اپنا معاملہ تھا اور اگر لڑکا اتنا بیوقوف تھا کہ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے یہاں سے چلے جانا چاہیے، یہ لڑکے کا مسئلہ تھا۔ میں کون ہوتا تھا رائے دینے والا۔

لیکن بھئی میں صاف بات کروں گا کہ میں بہت حد تک ماں کو قصوروار ٹھہراتا ہوں جو کچھ بھی تھا یہ اس کی ذمہ داری تھی کہ وہ لڑکے کو سمجھاتی کہ اب اسے زندگی خود گزارنا ہو گی اور یہ بھی کہ بڈھا اپنی بدمزاجی کی کیفیتوں میں سے ایک میں ہے، اس لئے لڑکے کے لئے بہتر یہی تھا کہ وہ اب جبکہ بظاہر سب ٹھیک ہو گیا تھا، یہاں سے چلا جائے لیکن میں نہیں سمجھتا کہ اس کے پاس اتنی عقل یا ذہانت تھی۔ اس نے تو کبھی بھی کسی بھی موقعے پر ذرا برابر حوصلہ نہ دکھایا تھا۔

البتہ اب ان کے درمیان جو بھی معاہدہ طے پایا تھا انہوں نے کچھ دن تو اس پر ضرور عمل کیا۔ لڑکا اپنی ماں کے ساتھ ساتھ رہتا ___ میرا خیال ہے کہ وہ گھر میں اس کی مدد بھی کرتا؛ ویسے میں نہیں جانتا کہ آیا وہ ایسا کرتا تھا یا نہیں، رہا بڈھا ___ تو وہ انہیں اکیلا چھوڑ دیتا اور زیادہ سے زیادہ اپنے آپ میں مگن رہتا۔

وہ اکثر پل کے ساتھ بیٹھا رہتا، افسردہ، کمر جھکائے، سمندر کی اور ٹکٹکی باندھے تکتے ہوئے، چہرے پر عجیب مغموم سا تاثر لئے۔ ایسے میں وہ عجیب وغریب مخلوق دکھائی پڑتا لیکن تنہا تنہا!! لیکن مجھے یہ صورتِ حال کچھ اچھی نہیں لگی۔ میں نہیں جانتا کہ اس کے خیالات کیا تھے، پر مجھے یقین ہے کہ وہ شیطانی خیالات تھے بدی سے بھرپور۔ اچانک ایسا محسوس ہونے لگا جیسے یہ بڑی پرانی بھولی بسری یاد ہو جب وہ بیگم اور بچے__ ایک مسرور اور مطمئن پارٹی__ مچھلی کے شکار کو گئے تھے۔ اب بڈھے کے حالات یکسر بدل گئے تھے، اے سردی میں باہر پھینک دیا گیا تھا، جبکہ بیگم اور لڑکا اکٹھے رہ رہے تھے۔ میرے دل میں اس کے لیے رحم کے جذبات اُبھرے، لیکن میں کچھ خوفزدہ بھی ہو گیا، میری چھٹی حس نے احساس دلایا کہ یہ صورتِ حال لمبا عرصہ نہ چلے گی، بلکہ کچھ نہ کچھ ضرور وقوع پذیر ہوگا!

ایک دن میں پانی میں تیرتی لکڑیاں جمع کرنے کے لیے نیچے سمندر کنارے گیا، راستے میں تیز ہوا چل رہی تھی__ اور جب میں نے یونہی جھیل کی طرف نگاہ کی تو میں ٹھٹھک گیا__ لڑکا اپنی ماں کے ساتھ نہیں تھا۔ وہ آج پھر اس جگہ واپس کھڑا تھا جہاں میں نے اسے پہلے دن دیکھا تھا__ دلدل کے کنارے پر__ وہ اتنے ہی بڑے حبشے کا مالک تھا جتنا بڑا اُس کا باپ تھا۔ اگر اُسے معلوم ہوتا کہ اپنی طاقت کو کیسے استعمال کرتے ہیں تو وہ کسی بھی دن بڈھے کے لیے مدِ مقابل ثابت ہوسکتا تھا، لیکن اس کے پاس دماغ ہوتا تو تب ناں! تو جناب وہاں وہ تھا، دلدل کنارے، ایک عظیم الحبثہ خوفزدہ احمق بندہ اور دوسری طرف بڈھا تھا، اپنے گھر کے باہر__ نیچے اپنے بیٹے کی طرف دیکھتے ہوئے__ اپنی آنکھوں میں کینہ اور جان سے مار ڈالنے کا جذبہ لیے__!

میں نے خود سے کہا ''بڈھا لڑکے کو مارنے جا رہا ہے'' لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ کیسے، کب اور کہاں؟ آیا رات کو__ جب وہ سو رہے ہوں گے، یا دن کو، جب وہ مچھلیوں کا شکار کر رہے ہوں گے۔ ماں تو ویسے بھی بالکل بے کار شے تھی، وہ کسی بھی حادثے کو ہونے سے روک ہی نہیں سکتی تھی۔ لہٰذا اس سے اپیل کرنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ بس صرف اگر لڑکا ذرا سمجھ داری سے کام لے اور یہاں سے چلا جائے__!

میں برابر ان کی نگرانی کرتا اور رات گہری ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔ رات بھر تیز مینہ برستا رہا۔ دھند، ٹھنڈ اور اگرئی کہر میں ڈوبا دسمبر ہر طرف تھا، درخت پتوں سے محروم ننگے بُچے اُجڑے نظر پڑتے تھے۔ میں جھیل پر نیچے نہ جا سکا۔ لیکن بعد میں دوپہر تک مطلع صاف ہو گیا اور تب سردیوں کا مخصوص بے مزہ پھیکا پھیکا اور بھیگا بھیگا سورج یوں چمکنے لگا جیسے دور سمندر میں نیچے غروب ہونے سے پہلے پانی کا بڑا سا بلبلہ پھوٹ بہا ہو!

میں نے بڈھے اور بیگم کو دیکھا دونوں ایک مرتبہ پھر ایک دوسرے سے بہت قریب اپنے بوسیدہ گھر کے ساتھ کھڑے تھے۔ انہوں نے مجھے آتے دیکھا کیونکہ وہ میری طرف متوجہ تھے، لیکن لڑکا وہاں کہیں نہ تھا نہ تو دلدل پر اور نہ ہی جھیل کنارے!!!

میں نے پل پار کیا اور جھیل کے دائیں کنارے کے ساتھ ساتھ چلتا گیا، میں نے اپنی چھوٹی دوربین سے ہر طرف دیکھا لیکن میں لڑکے کو کہیں نہ دیکھ سکا۔ اس سارے عرصے میں، میں باخبر رہا کہ بڈھا مجھے بڑے غور سے دیکھ رہا ہے۔ اور پھر جناب میں نے اُسے دیکھا۔ میں نے ہاتھوں پیروں کے بل بڑی مشکل سے دلدل کو پار کیا اور سرکنڈوں کے پیچھے پڑی اس چیز کی طرف گیا جو وہاں ڈھیر کی صورت موجود تھی۔

وہ مر چکا تھا۔ اس کے جسم پر ایک بہت بڑا اور بہت گہرا گھاؤ تھا۔ اس کی کمر پر سوکھا خون جما ہوا تھا۔ لیکن وہ ساری رات وہاں پڑا رہا تھا کیونکہ اس کا جسم بارش کے پانی میں شرابور تھا۔

ہوسکتا ہے جناب آپ مجھے احمق جانیں، گاؤدی تصور کریں لیکن میں نے کسی احمق ہی کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا اور روتے روتے میں دوسری طرف کھڑے بڈھے پر چلایا ''او ظالم، خونی، قاتل، تجھ پر خدا کی لعنت ہو'' لیکن اس نے کوئی جواب دیا اور نہ اپنی جگہ سے جنبش کی، وہ مسلسل، دور دوسرے کنارے اپنے بوسیدہ گھر اور اپنی محبوب بیگم کے ساتھ کھڑا__ مجھے دیکھتا رہا۔

آپ یقیناً جاننا چاہیں گے کہ پھر میں نے کیا کیا۔ میں اپنے گھر واپس گیا، ایک بیلچہ لے کر آیا اور میں نے دلدل کے پیچھے سرکنڈوں میں لڑکے کے لیے قبر کھودی۔ میں چونکہ اس کے مذہب کے بارے میں یقین سے نہ کہہ سکتا تھا کہ وہ کس مذہب کا پیروکار تھا، اس لیے میں نے اپنی دعاؤں میں سے ایک دعا اس کے لیے کی۔ تدفین سے فارغ ہوا تو میں نے جھیل کی دوسری طرف کھڑے بوڑھے آدمی کی طرف دیکھا اور آپ جانتے ہیں کہ میں نے کیا دیکھا؟

میں نے دیکھا کہ اس نے اپنا بڑا سا سر جھکایا، پھر وہ اپنی بیگم کی طرف جھکا اور اس سے لپٹ گیا۔ بیگم نے بھی اپنا سر اٹھایا اور اس کی آغوش میں سمٹ گئی۔ یہ ایک طرح کا نوحہ بھی تھا اور دعائے خیر بھی۔ ایک کفارہ بھی تھا اور حمد وثنا بھی! اپنے حیران کن انداز میں وہ جانتے تھے کہ انہوں نے بدی کا کام کیا ہے۔ لیکن اب لڑکا ختم ہو چکا تھا، کیونکہ میں نے لڑکے کو دفن کر دیا تھا اور وہ ہمیشہ کے لیے اس دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔ دوبارہ اکٹھے رہنے کے لیے اب وہ آزاد تھے، اور کوئی تیسرا ایسا موجود نہ تھا جو انہیں ایک دوسرے سے الگ رہنے پر مجبور کرتا۔

وہ جھیل کے درمیان میں آ گئے اور اچانک میں نے دیکھا کہ بڈھے نے اپنی گردن کھینچ کر لمبی کی، اپنے پر پھڑ پھڑائے اور پھر وہ دیکھتے ہی دیکھتے پانی پر سے فضا میں بلند ہو گیا__ طاقت سے بھرا ہوا__ مضبوط اور قوی__ اس کے پیچھے پیچھے وہ بھی فضا میں بلند ہو گئی۔ میں نے دو شاندار راج ہنسوں کو کھلے سمندر میں اڑتے دیکھا وہ سیدھے ڈوبتے سورج کی طرف پرواز کر رہے تھے اور میں آپ کو کیا بتاؤں جناب کہ یہ بے انتہا خوبصورت نظارہ تھا جو مجھے اپنی ساری زندگی میں بس ایک ہی مرتبہ دیکھنے کو ملا۔ دو راج ہنس وہاں اڑتے ہوئے، دسمبر میں اور تنہا!!!

☆☆☆

اوریانہ فلاشی / خالد سعید قسط نمبر ۶

ایک مرد

کمرہ عدالت بے حد چھوٹا تھا اور اس میں بدبو کے بھبکے آ رہے تھے کیونکہ اس سے ملحق برآمدے میں واقع بیت الخلا کے گٹر بند تھے۔ مرکزی دیوار پر مقدس کنواری اور اُس کے بچے کی شبیہہ تھی جو بلاشبہ اس بدبو کا نشانہ بننے والوں کو بخش دینے کے عمل سے گزار رہے تھے؛ سبز وردیوں میں کسے اور گھٹے ہوئے فوجی، جن کے لباس پر سنہری بٹن اور سرخ تمغے نمایاں تھے، اور یہ افسران جنتا کے غلام بادام تھے۔ ججوں کے بائیں جانب ایک پچپچے چہرے اور گنجے سر والا مجسٹریٹ تھا؛ وہ پبلک پراسیکیوشن کا نمائندہ تھا اور اس کی وہاں موجودگی مقدمہ کو غیر قانونی بنا سکتی تھی، کیونکہ وہ ایک آفیسر نہ تھا۔ دائیں جانب ملزمان کا کٹہرہ تھا۔ جس میں تمہارے علاوہ چودہ دیگر ملزمان بھی موجود تھے۔ کٹہرے کے سیدھے ہاتھ اور عدالت کے مقابل وکلاء صفائی کے ڈیسک تھے۔ اُن کے ناموں کا اعلان آخری لمحات میں کیا گیا تھا اور انہیں تفتیش کے نتائج سے آگاہ کرنے کی زحمت بھی نہ کی گئی تھی۔ اُن کی کمروں پر سیاہ فیتے بے ترتیبی اور بے ڈھنگے پن سے بندھے تھے۔ خوف اور سردی سے منجمد، وہ برقی تاروں پر بیٹھے ہوئے چھوٹے چھوٹے پرندے لگ رہے تھے۔ اُن میں سے ایک نے آگے کو جھانکتے ہوئے کہا، ''مقدمہ کی کاروائی کو ملتوی ہو جانا چاہیے، کاروائی کو ملتوی ہو جانا چاہیے!'' اُن کے پیچھے صحافیوں کا ڈیسک تھا، جنہیں ہزار پابندیاں لگانے کے بعد یہاں آنے کی اجازت دی گئی تھی۔ ریڈیو سے آنے والے لوگوں کو ٹیپ ریکارڈ لانے کی اجازت نہ تھی۔ ٹی وی والے فلم کیمرہ نہ لا سکتے تھے اور عام کیمرہ بھی اُسی صورت اگر چیف جج اس کے لیے خصوصی اجازت نامہ جاری کرے اور آخر میں عام پبلک کے لیے ایک ایک انکلوژر تھا، جہاں انتہائی چھان بین اور جائزہ کے بعد آنے کی اجازت تھی۔ ملزمان کے دوستوں اور عزیزوں کو مقدمہ کی کاروائی دیکھنے کی اجازت نہ تھی۔ تم ایک پتھرائی خاموشی میں وہاں داخل ہوئے۔ چلتے ہوئے تمہارا سر بلند تھا اور ہاتھ پشت سے بندھے تھے۔ دو پولیس والوں نے تمہاری دونوں کہنیوں پر دباؤ ڈالا ہوا تھا۔ اُن دونوں کی معیت میں تم سامنے والی قطار تک پہنچے، جو کٹہرے کی ریلنگ کے ساتھ تھی اور پھر یہاں پہنچا کر انہوں نے تمہارے ہاتھوں کو کھول دیا۔ تم ایک بے حد ڈھیلی فوجی یونیفارم میں تھے اور اپنے سائز سے کہیں بڑی یونیفارم تمہیں اس لیے فراہم کی گئی تھی تا کہ تم عدالت میں بے ڈھنگے اور اَن گھڑ لگو۔ اَب سے دو گھنٹے قبل انہوں نے تمہیں یہ وردی پہنانے کے لیے بہیمانہ تشدد سے کام لیا تھا۔ کیونکہ تم یہ وردی پہننے کے لیے قطعاً تیار نہ تھے اور باقی چودہ ملزمان کی مانند سویلین لباس پر اصرار کر رہے تھے۔ انہوں نے زبردستی تمہیں یہ وردی پہنائی اور پھر اعلان کیا کہ نہ صرف یہ کہ یہ لباس تمہیں پورا آیا ہے بلکہ تم پر جچ بھی رہا ہے۔ بالخصوص گردن اور کندھوں کی فٹنگ تو مثالی ہے۔ اور واقعہ یہ تھا کہ وردی اس قدر ڈھیلی ڈھالی تھی کہ اس میں تمہاری گردن تیر رہی تھی اور کاندھے جھول

رہے تھے۔ دراصل اِن نوے دنوں میں تم بے حد دُبلے ہو گئے تھے اور تمہارا وزن اپنے معمول کے وزن سے پچیس پونڈ کم ہو چکا تھا۔ تمہارا چہرہ وحشت زدہ تھا اور گال اندر کو دھنسے ہوئے تھے۔ تمہاری رشتے کی ایک خالہ کسی طرح یہاں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ مگر وہ تمہیں نہ پہچان پائی۔ ''مجھے تو وہ یہاں نہیں دکھائی دے رہا۔ یہاں تو وہ کہیں نہیں، کب آئے گا وہ یہاں؟'' وہ کٹہرے میں تمہارے چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے بڑبڑاتی رہی۔ لیکن تمہاری آنکھوں سے جیون دھارا چھلکتی تھی اور تم بے حد تمکنت اور پورے غرور سے مسکرا رہے تھے۔ ایسی خوش گستاخی کہ عدالت میں موجود افراد کے لیے تم پر کسی طرح کا ترس کھانا ممکن نہ رہا تھا۔ علاوہ ازیں وہ تمہارے کیس کے بارے میں کچھ بھی نہ جانتے تھے اور تم پر ڈھائے گئے ظلم وستم کی کتھائیں تو ای ایس اے کے دفتر سے باہر نہ جا سکی تھیں۔ تمہارے بارے میں اُن کا علم محدود تھا۔ ایک تنگ نظر اور سفاک اجرتی قاتل، ایک عام مجرم، جس نے پیسے کی خاطر یہ گھناؤنا جرم کیا تھا۔ انہیں یہ اطلاعات حکومت کے پٹھو پریس نے فراہم کی تھیں۔ لفظوں کے وہ بزدل بیوپاری جو کسی جمہوری حکومت میں خود کو جرأت اور آزادی کے پیکر ثابت کرتے ہیں لیکن جیسے ہی ایک آمر کا ورود نا مسعود ہوتا ہے، وہ طوائفوں کی مانند اُس سے ہم بستر ہو جاتے ہیں اور اُس کی خدمت کے لیے وہ اُن لوگوں پر ہزار طرح کی تہمتیں دھرتے ہیں کہ پہلے جن کی وہ ستائش کرتے تھے اور پہلے جن لوگوں کی کھل کر مذمت کرتے تھے اَب اُن کی ہر طرح سے مدح کرتے ہیں۔ وہ آمر کی تعریف کرتے ہوئے، مسولینی کی پیازا اونیزیا Piazza Venezia کی عظیم الشان ریلی کا ذکر کرتے ہیں یا پھر وہ ماوزے تنگ کی جسمانی طاقت کا ذکر کرتے ہیں جو چوہتر برس کی عمر میں دریائے یانگ زی میں تیرتا ہے اور جب آمریت کا نجس دور ختم ہوتا ہے اور جمہوریت بحال ہو جاتی ہے تو وہ پھر نئے سرے سے اپنا کردار ادا کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ بے شرم، بے حیا، اُن کے ساتھ کچھ بھی تو نہیں ہوتا۔ کیونکہ پھر اُن کی ضرورت آن پڑتی ہے۔ جیسے موچی، گورکن اور طوائفیں۔ نئے آقا ایک تابع فرمان، بودے اور زرد پریس کے بغیر کیا کریں گے؟ وہ اس کے بغیر اپنا نظام کیسے چلائیں گے، حکم دینے والوں کے جادو اثر معالج، جو وعدے کرتے ہیں اور خوفزدہ کرتے ہیں؟ آٹھ برس بعد، تمہاری موت کے بعد وہ اُسی طرح تمہاری ستائش بھی کریں گے اور وہ اپنے اخباروں میں تمہارا ذکر کریں گے، مرگ ویری، لافانی۔ اَب وہ کھل کر تمہاری مذمت اور بے توقیری کرتے ہیں۔ وہ اِس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ مستقبل میں انہیں کوئی خطرہ نہ ہوگا: تمہارے دفاع کے لیے کوئی سیاسی جماعت، منظّم نظریہ اور باقاعدہ مذہب موجود نہیں۔

وہ تمہاری فردِ جرم سناتے ہیں، ریاست کو نقصان پہنچانے کی کوشش، غداری، ریاست کے چیف اگزیکٹو کو ہلاک کرنے کی کوشش اور یہ کہ تمہارے قبضہ سے اسلحہ اور دھماکہ خیز مواد کی برآمدگی۔ تم نے اپنی مسکراہٹ کو برقرار رکھتے ہوئے اور آنکھوں کو حرکت دیئے بغیر یہ سب کچھ سنا۔ جو انہوں نے کہا، وہ سب سچ تھا اور تمہیں اس امر سے انکاری کا خیال تک نہ تھا۔ لیکن پھر انہوں نے دعویٰ کیا کہ تم نے اپنے جرم کا اقرار ایک دستخط شدہ بیان میں کیا ہے جس میں تم نے اپنے ساتھیوں کی مذمت کی ہے اور پھر تو

اندھوں کو بھی نظر آ گیا کہ تم کون تھے۔تم نے خود کو فوجیوں کی گرفت سے چھڑایا، اپنے قدموں پر اچھلے اور اپنی انگشت شہادت سے ججوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پورے زور سے چلائے: ''کذاب! میں نے کسی بھی کاغذ پر دستخط نہیں کیے، اور تم اس بات کو پوری طرح سمجھتے ہو۔کسی بھی ایسی دستاویز پر میرے دستخط، جعلی طور پر بنائے گئے ہیں اور یہ سب کچھ میجر ہیزز کس(Hazizkis) کا کیا دھرا ہے اور تم اِس بات سے اچھی طرح واقف ہو، فوجی آمر کے کاسہ لیسو!'' ''ملزم، خاموش رہو!'' ''لیکن کس نے مجھ پر الزام لگایا؟ تم؟ تم نے مجھ پر الزام دینے کی جسارت کی؟ تم! میں وہ شخص ہوں، جو تمہیں الزام دیتا ہے، میں تمہیں مجرم قرار دیتا ہوں، میں تم پر ہزار لعنت بھیجتا ہوں، میں تمہاری مذمت کرتا ہوں، اس لیے کہ تم جھوٹے ہو اور ایذا رساں ہو!'' تم نے اپنی قمیض کے بٹن کھولنے کی کوشش کی تا کہ اپنی چھاتی پر لگے زخموں کو دکھا سکو۔وہ زخم جو میجر تھیوفلیوانکوس نے تمہارے پہلو میں لگائے تھے۔''ملزم کو عدالت میں اپنے ننگ کی نمائش کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی''۔''میں لباس اتاروں گا، اگر ثبوت دینے کے لیے یہ ضروری ہوا تو''۔''مگر کس شے کا ثبوت؟'' ''اس شے کا واضح ثبوت کہ دورانِ تفتیش مجھ پر بہیمانہ تشدد کیا گیا! چاقوؤں سے میرے جسم کو چیرا گیا، مجھے ڈنڈوں سے دھنا گیا، آہنی کوڑے برسائے گئے!'' ''خاموش!'' ''میرے اعضائے پوشیدہ پر جلتے سگریٹوں کے نشانات! میرے پیروں کے تلووں پر فلانجی!'' ''بکواس بند کرو خاموش!'' ''میرے پیشاب کی نالی میں آہنی سوئیاں ڈالی گئیں، مجھے جنسی تشدد کا نشانہ بنایا گیا!'' ''عدالت ملزم کو خاموش رہنے کا حکم دیتی ہے،'' ''میرے گلے کو دبا کر مجھے میری ہوا سے محروم کیا گیا، ٹھڈے، ٹھوکریں، ضربیں، مجھے اس عدالت میں لانے سے پہلے بھی پیٹا گیا اور نوے دن تک، نوے دن! مسلسل انہوں نے میرے ہاتھ پاؤں باندھے رکھے۔انہوں نے مجھے مسلسل جگائے رکھا، پیشاب تک نہ کرنے دیا! میں کہتا ہوں، میں پُر زور مطالبہ کرتا ہوں کہ اس بھری عدالت کے سامنے کوئی ڈاکٹر میرا طبی معائنہ کرے اور جو جو میں نے اپنے بیان میں کہا ہے اس کے سچ جھوٹ کا تعین کرے۔میں پُر زور مطالبہ کرتا ہوں کہ میجر ہیزز کیس(Hazizkis) اور میجر تھیوفلیوانکوس(Theophiloinnakos) پر فراڈ کے الزام میں مقدمہ چلایا جائے۔میں مطالبہ کرتا ہوں کہ اِن دو کے علاوہ اسسٹنٹ انسپکٹر بابالس(Bablis) اور اسسٹنٹ انسپکٹر مالیوس(Malios) تمہارے صدر کے بھائی کوسٹاس پاپا ڈوپاولس Costos) (Papadopoulous اور ای۔ایس۔اے کے افسران پر غیر قانونی تشدد کے الزام میں مقدمہ چلایا جائے، میں مطالبہ کرتا ہوں کہ۔۔۔'' ''ملزم خاموش! تمہاری یہ گفتگو مقدمہ کی کاروائی سے غیر متعلق ہے!'' ''اگر اِن چیزوں اور حقائق کا مقدمہ کی کاروائی سے کوئی تعلق نہیں، تو اے عدالت کے جج، میاں مٹھو، مجھے یہ بات کہنے میں کوئی باک نہیں اور میں یہ کہنے میں پوری طرح حق بجانب ہوں کہ تم بھی غیر آئینی اور آمرانہ سرکار کے پٹھو ہو۔'' اس جملے پر انہوں نے تمہیں توہین عدالت کے جرم میں دو برس کی قید سخت کی فوری سزا سنا دی۔

مقدمہ پانچ دنوں تک جاری رہا اور قانونی نکتہ نظر سے یہ محض ایک ڈھونگ تھا'' کسے وکیل

کریں کس سے منصفی چاہیں'' گواہ بھی وہی لوگ تھے کہ جنہوں نے دورانِ تفتیش تمہیں زدوکوب کیا تھا اور بدترین تشدد کا نشانہ بنایا تھا اور اپنی حماقت مآبی، جلدی یا آمر کو خوش کرنے کے جوش میں یکے بعد دیگرے انہوں نے اپنے بیانات میں اس امر کی تصدیق بھی کر دی، لیکن مقرر کردہ وکلاء صفائی میں کسی قسم کا اعتراض اٹھانے کی جرأت نہ تھی۔تمہاری صفائی میں انہوں نے صرف دو یا تین گواہان کو طلب کیا۔مگر انہیں بیان دینے سے پہلے سختی سے دھمکایا گیا اور سنگین نتائج کی یاددہانی کرائی گئی۔لہٰذا اُن قسمت کے ماروں نے اپنے بیانات میں وہی کچھ کہا کہ جو وکیل استغاثہ لیاپس(Liappis) نے انہیں اچھی طرح یاد کرایا تھا۔وہ اس خوف میں مبتلا تھا کہ کہیں فوجی حکمران اُس سے خفا نہ ہو جائیں۔لہٰذا وہ خود کو شاہ سے زیادہ شاہ کا وفادار ثابت کرنے میں جُٹا رہا۔لیاپس(Liappis) کو دورانِ سماعت جب بھی موقع ملتا۔تو وہ تمہیں اپنی تنقیص وتنقید کا نشانہ بناتا۔وہ ایک بلند بانگ لہجے میں یہ اصرار کرتا کہ تم بیرونی طاقتوں کے آلہ کار اجرتی قاتل تھے اور یہ کہ تم پولی کارپوس جارجازیز(Georgazis) کے ایجنٹ خاص تھے۔دشمن آئین و قانون، ایک ڈاکو اور امن وامان کو تہ وبالا کرنے والے، جو ہر ملک اور معاشرت میں قابلِ نفرت وحقارت ہوتا ہے اور اپنے دلائل کے ثبوت میں اُس نے تمہارے اُس اعتراف نامہ کو استعمال کیا کہ جس سے تم نے صریحاً انکار کیا تھا۔ایک بار جب تمہارے وکیل صفائی نے ذرا ہمت کرتے ہوئے صرف اتنا کہنے کی کوشش کی کہ کسی نتیجہ پر پہنچنے سے پہلے تمہارے انکارِ جرم کو ملحوظ خاطر رکھا جائے، تو اسے بری طرح جھڑک کر بٹھا دیا گیا۔تمہارا وکیل تم سے مشورہ بھی نہ کر سکا۔انہوں نے اس دوران تمہیں دو پولیس والوں کی موجودگی میں اُس سے چند منٹ گفتگو کرنے کی اجازت دی۔پولیس والے نہ صرف یہ کہ تمہاری گفتگو سن رہے تھے، بلکہ اُس پر اپنے تبصرے بھی کر رہے تھے اور بیچ میں ہر طرح کی مداخلت بے جا بھی کر رہے تھے۔پھر ان میں ایک تیسرا بھی شامل ہو گیا۔وہ تمہارے پیچھے کھڑا ہو گیا اور تمہیں اپنی بکواس بند کرنے کے لیے کہا۔لیکن تمہارے رویے میں اُن کی حسبِ خواہش کوئی تبدیلی پیدا نہ ہوئی۔دورانِ سماعت جب بھی ضرورت پڑتی تم کھڑے ہو کر پُر زور احتجاج کرتے اور اُس کے کذب اور ریاکاری کو بے نقاب کرتے اور اس شے نے ججوں کو ایک قابلِ تعریف انداز میں تم سے متاثر ہونے پر مجبور کر دیا۔کیا کبھی کسی عدالت نے ایسا شخص دیکھا ہے، جو اس قدر مہارت، روانی، دلائل اور جرأت کے ساتھ ملزم کو مدعی میں تبدیل کر رہا ہو؟ لیکن کیا یہ شخص پاگل ہے یا خودکش بمبر؟ کیا اُسے اِس بات کا مطلق کوئی احساس نہیں کہ اس طریقے سے عمل کر کے وہ خود اپنی موت کے پروانہ پر دستخط کر رہا تھا؟ اس کے باوجود ہر شخص محسوس کر سکتا تھا اور یہ ایک بدیہی بات تھی کہ تم اس امر سے اچھی طرح واقف تھے کہ اِس طریقے سے عمل کرتے ہوئے تم اپنے سر کو داؤ پر لگا رہے تھے تم اپنے پانسے ججوں کی جانب یوں پھینک رہے تھے، جیسے جواء خانے میں جوئے کی میز ایک تیزی میں گھومتی ہے۔لیکن یہ کوئی اندھی چال نہیں تھی۔تم ایک چالاک لاتعلقی کے ساتھ، ہر شے کا حساب رکھتے ہوئے، ہر عمل کے نتائج کا لحاظ رکھتے ہوئے، ہر لفظ اور جملے کو تولتے ہوئے، دلاوری کے ہر اشارہ اور علامت کو استدلال، جبلت اور زیرکی سے جائزہ لیتے ہوئے اپنے پتوں کو استعمال میں لا رہے

تھے۔ایک بے حد شاطر جواری کی مانند جو جوئے کی میز پر محض چھوٹی رقمیں جیتے نہیں جاتا۔تم نے بہت برسوں کے بعد اپنے عمل کی وضاحت کی۔ یہ کہ تم جانتے تھے اور یہ سچ تھا کہ ایسا کر کے تمہارے بچ نکلنے کے بہت کم امکانات تھے۔بمشکل ایک فیصد، ننانوے فیصد امکان یہی تھا کہ وہ تمہیں موت کے گھاٹ اُتار دیں گے۔لیکن ساتھ ہی تمہیں یہ بھی علم تھا کہ تمہاری شرط کی رقم بے حد بھاری تھی۔''یہ بازی عشق کی بازی ہے، جو چاہے لگا دو ڈر کیسا گر جیت گئے تو کیا کہنے ہارے بھی تو بازی مات نہیں''

تم ایک ایسے نفسیاتی نظام کو استعمال میں لا رہے تھے جو انہیں حیرت زدہ اور پریشان کر دے اور یہ شے تمہیں الزام دینے والوں کے دلوں کی پتھریلی سرزمینوں میں شک وشبہ کے بیج بو سکتی تھی۔ یہ شخص جو خود پر اس قدر اعتماد کا حامل ہے اور اِس تیقن کے ساتھ دلائل دے رہا ہے۔ممکن ہے وہ صحیح اور صائب ہی ہو؟ سو دن بدن تم زیادہ فیصلہ کن اور جارح ہو گئے تھے۔تم ندامت کی بجائے اپنے افعال پر فخر وغرور کا اظہار کرتے۔تمہارے برعکس دیگر ملزمان جنہوں نے اپنی ذہنی شکست قبول کر لی تھی۔انکار جرم کرتے، معافی کے خواستگار ہوتے، ایک دوسرے پر الزام لگاتے یا پھر سارا ملبہ تم پر ڈال دیتے۔ جینے کا ایک فیصد امکان روز بروز بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

آخر وہ دِن بھی آن پہنچا، جب تمہارے نکتہ نظر کے بیان کے بعد لیاپس(Liappis) نے اپنے حتمی دلائل دینے تھے اور پھر وہ کچھ ہو گیا کہ جس کی پیش بینی تم نے قطعاً نہ کی تھی: دراصل تمہیں موت کے خیال سے محبت ہو گئی تھی۔اس کھیل کو جاری رکھنے کا فائدہ؟ یہ دیکھنا کہ وہ لوگ تمہیں وہ سزا دیں کہ جس کا مطالبہ تم خود اپنے سر پر غرور کے ساتھ کرو گے؟ نشانہ بننے والے کا کردار؟ نشانہ بننے یا مظلوم بننے کے کردار کو ہمیشہ پوری سختی کے ساتھ مسترد کر دینا چاہیے۔نشانہ بننے کا کردار ادا کرنے سے کبھی کچھ حاصل نہیں ہوتا اور یہاں تمہیں ایک سنہری موقع ملا تھا اور جس کا تم نے محض خواب ہی دیکھا: دنیا پر یہ ظاہر کرنے کا موقع کہ تم کون تھے اور تم کِس شے پر یقین رکھتے تھے۔ایجنسیوں کا پروردہ زرد پریس تو اس پر کوئی توجہ نہ دے گا۔لیکن بیرونی نامہ نگار اور صحافی ضرور اس کی جانب متوجہ ہوں گے۔ پھر انہیں حکم عدولی کرنے میں کوئی ذاتی خطرہ بھی نہیں۔لہٰذا وہ اُس مرد کے بارے میں پورا سچ ضرور بتائیں گے جو بغیر ہار مانے، جھکے بغیر اور خوفزدہ ہوئے بغیر اُس خیر واحد کی خاطر ایک مرد کی طرح جیا اور مرا۔ واحد شے جو واقعی اہم تھی۔ آزادی۔اور ممکن ہے کہ خود تمہارے اپنے دیس میں کوئی سب لوگوں کو اس بارے میں بتائے۔شاید کوئی جج، کوئی وکیل، کوئی پچھتاتا ہوا فوجی یا پولیس والا اور بہت سے لوگوں کو پتہ چل جائے گا۔ایک بار تم مر گئے تو وہ تم سے محبت کریں گے اور ممکن ہے اُن میں سے کچھ تمہارے نقش قدم پر چل پڑیں اور پھر تم اکیلے نہیں رہو گے۔''لمبی ہے غم کی رات مگر رات ہی تو ہے'' اور یوں ظلم کے شکار، ملزمان اُٹھ کھڑے ہوں گے۔ قانون کے مطابق چیف جج نے تمہیں بلایا، کیونکہ پبلک پراسیکیوٹر سے پہلے ملزم کو اپنا بیان دینا ہوتا ہے۔ تینوں پولیس والوں نے تم پر اپنی گرفت ڈھیلی کر دی۔تم اُٹھ کھڑے ہوئے اور ایک ایک کر کے اِن سب بالشتیے ججوں سے نگاہیں چار کیں۔ایک صاف پر یقین، گھنٹیوں کی مانند بجتی ہوئی ایک بے حد حسین آواز

کمرہ عدالت میں بلند ہوئی۔

''کورٹ مارشل کے''معززین''، میری بات مختصر ہو گی۔ میں تمہیں قطعاً بور نہ کروں گا۔ میں اُس ناقابلِ بیان تفتیش اور ایذا رسانی کے بارے میں بھی بات نہ کروں گا کہ جو مجھے بھگتنا پڑی۔اس بارے میں، میں جو جو کچھ بتا چکا ہوں میرے خیال میں بہت کافی ہے۔ جناب والا، اس سے پہلے کہ میں اُن الزامات کا جائزہ پیش کروں کہ جو استغاثہ نے میرے خلاف گھڑے ہیں، میں! اس کیس میں اپنی ذات سے متعلق ایک اور پہلو کی جانب توجہ دلانا چاہوں گا: اور وہ آپ کی شرمناک جانبداری، آپ کی مذموم کاوشیں، جس کے ذریعہ جعلی شہادتوں، صریحاً غلط بیانی اور پہلے سے طے شدہ شہادتوں کے وسیلے سے دونوں جانب کے گواہان کو متاثر کیا گیا۔ بے سروپا الزمات کو وزنی قرار دے کر تسلیم کیا گیا۔میری دلیل کا مقصد ذاتی دفاع یا صفائی نہیں ہے؛ مجھے ایسا کرنے کی ضرورت بھی نہیں اور نہ ہی میں ایسا کروں گا۔اس کا مقصد محض اتنا ہے کہ میں آپ کی بدنیتی اور جھوٹ کو عیاں کروں اور خود میں تمہیں ملزم قرار دیتا ہوں اور یہ واقعتاً ایک درست امر ہے۔ جناب والا، اس سلسلے کی شروعات میں، مجھ سے ایک جعلی دستاویز کو منسوب کیا گیا اور یہی اِس مقدمے کا بنیادی اور مکرر محرک ہے۔میری رائے میں یہ ایک اہم دستاویز ہے۔ کیونکہ اس قبیل کے تمام ممالک میں مقدمات ایک مخصوص طریقے سے قائم کیے جاتے ہیں۔ جہاں آزادی کے ساتھ قانون کو بھی پوری بے دردی کے ساتھ ہلاک کیا جاتا ہے۔امر واقعہ یہ ہے کہ ہماری عدالت کوئی واحد شرمناک مثال نہیں ہے۔ بلاشبہ جب میں عین اس وقت تم لوگوں سے مخاطب ہوں تو آزادی اور قانون سے محروم دیگر ممالک میں بھی محبِّ وطن لوگوں پر اسی طرح کورٹ مارشل، خصوصی عدالتوں اور عام عدالتوں کے ذریعے مقدمات چلائے جا رہے ہیں اور اس کا واحد مقصد آمرانہ اور فاشی حکومتوں کی کاسہ لیسی اور خدمت کرنا ہے۔ان محبِّ وطن لوگوں کو بھی اسی طرح جعلی شہادتوں، غلط بیانات اور پہلے سے طے شدہ فیصلوں کے ذریعے گواہان کو مجبور کر کے سزا سنا دی جاتی ہے۔اُسی طرح کے اعتراف اور اقبال جرم جو مجھ سے نہ تو سرزد ہوئے اور نہ ہی میں نے اُن پر کوئی دستخط کیے۔حقیقت یہ ہے کہ اُس نام نہاد اقبالی بیان پر میرے دستخطوں کی بجائے، مجھے تشدد کا نشانہ بنانے والے مختشوں میجر ہیزز کس(Hazizkis) اور میجر تھیوفلیوانکوس(Theophiloiannkos) کے دستخط تھے۔افسوس صد افسوس کہ یہ لوگ ایسے ایذا رساں ہیں کہ جن کے دلوں کے کسی گوشے میں صرف ونحو کے عام اصولوں کا رتی برابر احترام بھی نہیں۔ گذشتہ شب میں اُن کے تحریر کردہ صفحات پڑھنے میں کامیاب ہوا۔ میں پورے یقین اور وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ مجھے اُن کی دروغ بیانی پر زیادہ طیش آیا یا صرف ونحو کی غلطیوں پر۔اگر میں نے اِن صفحات کو پہلے دیکھا ہوتا، تو میں آپ کو پورے وثوق سے یقین دلاتا ہوں کہ میں حالت کو ما (بے ہوشی) میں بھی ان غلطیوں کی تصحیح ضرور کرتا۔افسوس صد افسوس یہ فوجی سرکار کیسے کیسے جاہلوں اور نااہل افراد کو ملازمتیں فراہم کرتی ہے۔ بلاشبہ جہالت اور ظلم دونوں ہاتھوں میں ہاتھ لیے ایک ساتھ چلتے ہیں۔خیر کورٹ مارشل کے معززو، آپ لوگ منہ سے بے شک نہ کہیں دل سے تو اس بات کو جانتے ہیں کہ جعلی دستاویزات کا استعمال، قانونی اور

اخلاقی ہر دو لحاظ سے غلط ہے اور چونکہ اس مقدمہ کی بنیاد ایک جعلی دستاویز پر ہے۔ لہٰذا میں اس امر کا پورا استحقاق رکھتا ہوں کہ اس سارے مقدمہ کو باطل قرار دوں۔ خیر اس سے پہلے میں نے ایسا اس لیے نہ کہا تا کہ تمہارے غلیظ ذہنوں میں یہ سوچ نہ در آئے کہ میں اِن الزامات کا سامنا کرنے سے ہراساں ہوں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ میں اِن الزامات کو قبول کرتا ہوں اور ''مجھے اپنے جرم پہ ناز ہے'' میں نے اِس سے کبھی انکار نہ کیا۔ نہ ہی تفتیش کے دوران اور نہ ہی تمہارے روبرو اور آج میں پورے فخر کے ساتھ اسے پھر دوہراتا ہوں: ہاں، میں نے ہی وہ دھماکہ خیز مواد جائے واردات پر رکھا تھا۔ میں ہی وہ شخص تھا، جس نے دو بار ودی سرنگوں کے فیتے کو آگ دکھائی تھی اور یہ میں نے پورے ہوش وحواس میں اس لیے کیا تھا تا کہ اُس شخص کو ہلاک کر سکوں۔ جس نے ایک منتخب اور جمہوری حکومت کو غیر آئینی فوجی بغاوت کے ذریعے ختم کیا اور جسے تمہاری عدالت ''آئینی'' صدر کا نام دیتی ہے۔ میں شرمندہ ہوں بے حد شرمندہ، مجھے افسوس و رنج ہے، بے حد رنج وافسوس کہ میں اپنے مقصد کے حصول میں ناکام رہا۔ اِن پورے تین ماہ میں جو میری زندگی کے سب سے زیادہ تکلیف دہ لمحات تھے میں انتہائی رنج اور ندامت کے ساتھ خود سے یہ سوال پوچھتا رہا کہ اس سلسلے میں مجھ سے کہاں غلطی سرزد ہوئی اور میں خود نہیں تو اِس مقصد اعلیٰ کے حصول کی خاطر میں اپنی روح کو وہاں بھیجنا پسند کروں گا اگر خدا نے مجھے کبھی ایک اور زندگی عنائت کی تو میں ایک بار یہ سب کچھ ضرور کروں گا۔ مجھے یہ الزام بہ نفسہٖ برہم نہیں کرتا۔ لیکن یہ کہ اِن صفحات کے ذریعے تم نے مجھے بدنام کیا اور میری شہرت کو داغدار کیا۔ تم نے یہ اعلان کیا کہ میں ہی وہ شخص ہوں جس نے دیگر ملزمان کے ناموں کو افشا کیا۔ وہ سارے نام جو اِس عدالت میں پکارے گئے مثلاً قبرص کے وزیر پولی کارپس جارجازیز (Poly Carpos Georgazis) کا نام غلط طور پر لیا گیا۔ میری رسوائی اور روسیاہی کو واضح کرنے کے لیے اور اس الزام کو صداقت کا روپ دینے کے لیے مجھے الزام دینے والوں نے یہاں تک کہا کہ پولیس ریکارڈ میں، میں ایک ہسٹری شیٹر ہوں۔ یہ کہ لڑکپن میں میں ایک شہدا اور جوانی میں ایک مجرم اور بھاڑے کا ٹٹو ہوں۔ کورٹ مارشل کے معززین میرا پولیس ریکارڈ آپ کے سامنے ہے اور اس کے ذریعے آپ کو پتہ چل سکتا ہے کہ میں کبھی بھی شہدا، مجرم، چور یا بھاڑے کا ٹٹو نہیں رہا۔ میں ہمیشہ سے اور اَب بھی ایک ایسا جنگجو ہوں، جو خوشحال یونان، ایک بہتر سماج اور آنے والے سہانے دنوں کے لیے انتھک جدوجہد کرتا رہا ہوں۔ دوسرے لفظوں میں ایسا فرد جو انسانیت اور انسانوں میں یقین رکھتا ہے اور انسانوں میں یقین سے مراد، آزادی، آزادیٔ افکار، آزادیٔ اظہار، تنقید اور اختلاف رائے کا احترام اور اُن میں یقین رکھنا ہے: ہر وہ قابل قدر شے جسے پاپادوپاولس (Papadopoulous) کی فسطائی فوجی بغاوت نے ایک برس پہلے ختم کر دیا تھا اور اَب ہم اُن الزامات کی فہرست کی طرف آتے ہیں جو انہوں نے میرے خلاف عائد کئے تھے۔

''پہلی فرد جرم، بہ اعتبار اہمیت، تخریب کاری اور ریاست کا تختہ الٹنے کی کوشش ہے: پینل کوڈ کا آرٹیکل نمبر 509۔ جناب والا، کیا یہ ایک قول محال نہیں ہے کہ میرے خلاف فردِ جرم عائد کرنے والے

لوگ وہی ہیں کہ جنہوں نے اپریل 21، 1967ء کو آرٹیکل 509 کی خلاف ورزی کی؟ اور ایک آئینی اور منتخب حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ کسی بھی فرد جس میں ذرہ برابر عقل اور تقریباً اتنی ہی مردانگی ہو، کا بے ساختہ جواب ہوگا۔ ''وہ'' اور بلاشبہ وہ اس میں اُس شے کا اضافہ بھی کرے گا۔ جو اس وقت میں کر رہا ہوں۔ ایک فوجی آمر کے اختیار و حاکمیت سے انکار کر کے، میں نے آئین کے آرٹیکل 509 کا احترام کیا ہے، نہ کہ اس کی خلاف ورزی۔ لیکن مجھے خود کو یہ فریب دینے کی کوئی حاجت نہیں کہ میری دلیل تمہارے چھوٹے اور گھٹے ہوئے سروں میں سما سکے گی۔ کیونکہ اگر یہ ''فوجی انقلاب'' ناکام ہو جاتا تو فوجی جنتا کے ساتھ ساتھ تم سارے نام نہاد جج بھی عدالت کے اِس کٹہرے میں کھڑے ہوتے۔ لہٰذا اِس فرد جرم کے بارے میں مجھے مزید کچھ نہیں کہنا۔ اَب میں دوسری فرد جرم کے بارے میں بات کرتا ہوں: فوجی بھگوڑا ہونا۔ ہاں، یہ بالکل سچ ہے کہ میں فوج سے نکل بھاگا ''فوجی انقلاب'' کے چند دِن بعد میں نے اپنی یونٹ چھوڑ دی اور ایک جعلی پاسپورٹ پر بیرون ملک چلا گیا۔ میرا اگر کوئی جرم ہے تو وہ ہے کہ مجھے یہ سب کچھ تو فوجی انقلاب'' کے پہلے دِن ہی کر لینا چاہیے تھا۔ لیکن مجھے اس سلسلے میں اس لیے بری الذمہ قرار دے دینا چاہیے۔ کیونکہ ''فوجی انقلاب'' کے دِن، سرحدوں پر ترکی کے ساتھ حالات بے حد کشیدہ تھے اور اگر جنگ شروع ہو جاتی، تو ایک یونانی کی حیثیت میں میرا فرض اُس لڑائی میں حصہ لینا تھا نہ کہ فوج سے بھاگنا۔ قصہ کوتاہ، جنگ شروع نہ ہوئی تو میں نے کسی تاخیر کے بغیر اپنا دوسرا فرض ادا کیا اور فوج سے بھاگ نکلا۔ کورٹ مارشل کے معززین، اگر میں ایک غیر آئینی فوجی آمریت کی خدمات سرانجام دیتا تو یہ صحیح معنوں میں ملک سے غداری ہوتی۔ اس لیے میں نے فوجی بھگوڑا بننے کا فیصلہ کیا۔ اور اَب میں اُسی فرد جرم کی طرف آتا ہوں، جو تم ججوں کے لیے سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے: ریاست کے چیف ایگزیکٹو کو ہلاک کرنے کی کوشش۔ مجھ پر تشدد کرنے والے لوگوں کے بے ہودہ خرافات کے برعکس، میں اس سلسلے میں یہ کہنا چاہوں گا کہ میں تشدد کو پسند نہیں کرتا۔ مجھے اس سے شدید نفرت ہے۔ مجھے سیاسی قتل کسی صورت بھی گوارا نہیں، بالخصوص جب یہ ایسے کسی ملک میں واقع ہوں جہاں خود مختار پارلیمنٹ موجود ہو اور شہریوں کو آزادی اظہار، اختلاف کرنے اور مختلف طرح سے سوچنے کا حق حاصل ہو۔ میں قاتلوں کی پرزور مذمت کرتا ہوں لیکن جب ایک حکومت کو بندوق کے ذریعے مسلط کر دیا جائے اور یہ حکومت تشدد اور من مانے آرڈیننس کے ذریعے شہریوں کو آزادیٔ اظہار، اختلاف رکھنے کی آزادی حتیٰ کہ سوچنے کی آزادی سے بھی محروم کر دے، تو پھر ایسی حکومت کے خلاف تشدد فرض بن جاتا ہے۔ ویسے یسوع مسیح اور مہاتما گاندھی، اس شے کو تمہارے سامنے مجھ سے کہیں بہتر واضح کر سکتے ہیں۔ حضورِ والا، اس کے علاوہ کوئی اور طریقہ رہ بھی تو نہیں جاتا، اور اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ میں ایسا کرنے میں ناکام رہا۔ آج نہیں تو کل دوسرے لوگ یہ کریں گے اور مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ اس میں کامیاب و کامران ہوں گے۔ تم ذہنی طور پر اپنے آپ کو اس کے لیے تیار کرو۔ مجھے یقین ہے کہ اس خیال سے تمہاری ٹانگیں لرزتی رہیں گی۔

''نہیں، صدر کورٹ مارشل، براہِ کرم درمیان میں مٹ ٹو کو، مجھے میری بات مکمل کرنے دو۔ میں چوتھی فرد

جرم کی طرف آ رہا ہوں اور جلد ہی چار ہواؤں کی ہمرکابی میں تمہاری وردی پھڑ پھڑاتی پھرے گی۔ ابھی سے مت کپکپاؤ چوتھی فردِ جرم: دھماکہ خیز مواد کا قبضے میں ہونا۔ میں اس سلسلے میں اس کے علاوہ اور کیا کہہ سکتا ہوں، جو میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں۔ میں پوری وضاحت سے یہ بیان کر چکا ہوں کہ ملزمان میں سے صرف میرے دو ساتھیوں کو اتنا علم تھا کہ میں کسی حملہ کی تیاری کر رہا ہوں، لیکن وہ اس حملہ کی نوعیت سے قطعاً آگاہ نہ تھے۔ میں نے اُن دو بم دھماکوں کی ذمہ داری بھی قبول کی ہے۔ جو اُس دِن پارک اور سٹیڈیم میں پھٹے تھے۔ میں نے یہ امر صراحت سے واضح کیا ہے کہ یہ محض ایک پیشگی تنبیہہ تھی اور بم دھماکے اس انداز میں کئے گئے تھے کہ اس سے کسی شخص کا نقصان نہ ہو۔ اگر میرے ساتھی ملزمان کا دعویٰ اس سے مختلف ہے جو دستاویز پر اُن کے دستخط سے ظاہر ہوتا ہے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اُن کے اقبالی بیان پر دستخط سخت تشدد کے ذریعے حاصل کیے گئے ہیں۔ اگر میں میجر ہیزز کس (Hazizkis) اور میجر تھیوفلیوانکوس (Theophiloiannkos) کے ساتھ یہی سلوک کروں تو میں انہیں یہ کہنے پر بھی مجبور کر سکتا ہوں کہ اُن کی مائیں رنڈیاں تھیں اور والد، گانڈو۔۔۔ اور مجھے پورا یقین ہے کہ اسی طریقہ کار کو کام میں لا کر، پولی کارپوس جارجازیز پر الزام تراشی کی گئی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ پاپاڈوپاولس اس الزام میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے بہت کچھ کرے گا۔ تاکہ انہیں قبر پر چڑھائی کرنے کا جواز مل سکے اور وہ اُس کی آزادی اور خودمختاری کو اُسی طرح تاراج کر سکیں جیسے انہوں نے یہاں جمہوریت اور آزادی کو کچلا ہے لیکن اِن دونوں کو خود مستعفی ہونا چاہیے۔ میں جس جدوجہد کی نمائندگی کرتا ہوں۔ اس میں کوئی بیرونی شخصیت شامل نہیں۔ کورٹ مارشل کے جج، اس جدوجہد کا تعلق صرف اسی ملک سے ہے، کہیں باہر سے نہیں اور میرے گروپ کا نام ''مزاحمت یونان'' ہے اور اگر جارجازیز اس ''تحریک مزاحمت'' یا میرے لیے کام کر رہا ہے تو دنیا کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ ہوگا کہ ایک نجی سپاہی نے کسی ملک کے وزیر دفاع کو اپنا ملازم رکھا ہے لیکن ایسی صورت میں، تمہارا سوال ہوگا کہ پھر یہ دھماکہ خیز مواد آیا کہاں سے؟ کورٹ مارشل کے جج، تو یہ تو میں تمہیں کسی صورت نہیں بتاؤں گا۔ اگر میں نے بدترین تشدد سہہ کر بھی ابھی تک اس کا اعتراف نہیں کیا، تو کیا تم مجھ سے اس بات کی توقع کر سکتے ہو کہ میں بھری عدالت میں کی جانے والی تقریر میں اس کا اعتراف کروں گا۔ میرا بیان اب ختم ہوتا ہے لیکن اگر تمہیں بُرا نہ لگے تو میں اس میں ایک ذاتی عنصر کا اضافہ ضرور کروں گا اور یہ ایک بے حد معمولی سا معاملہ ہے۔ شاید میرے ذاتی فخر و غرور کا۔ تمہارے گواہان نے کہا کہ میں ایک انا پرست شخص ہوں۔ خیر اگر ایسا ہوتا تو بیرون ملک میں اک آرام دہ اور پُر آسائش زندگی بسر کر سکتا تھا لیکن اس کی بجائے میں جدوجہد کرنے کے لیے واپس آیا اور اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالا۔ مجھے اچھی طرح علم تھا کہ وطن میں سنگین خطرات میرے منتظر ہیں جیسے اب بھی مجھے علم ہے کہ تم مجھے کیا سزا سناؤ گے۔ درحقیقت میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم مجھے سزائے موت کا حکم سناؤ گے لیکن کورٹ مارشل کے جج، سنو کہ میں کبھی پیٹھ نہیں دکھاؤں گا۔ بلاشبہ میں پہلے سے ہی اس سزا کو قبول کر چکا ہوں کیونکہ ایک سچے جنگجو کا آخری گیت، اُس کے منہ سے نکلنے والی دھڑ دھڑاہٹ ہے جب آمریت کے فائرنگ سکواڈ کی

گولیاں اُس کے تار تار جسم میں پیوست ہو جاتی ہیں۔

کمرے میں ایک پتھر خاموشی تھی۔ منصفین مبہوتی کے عالم میں تمہیں ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے۔ چیف جج کو اپنی آواز دوبارہ پانے میں قریب قریب ایک منٹ لگا اور اُس نے وکیل استغاثہ لیاپس کو استغاثہ کے دلائل کو مکمل کرنے کے لیے کہا۔ لیاپس (Liapis) نے تمہاری کسی بات یا دلیل کا حوالہ دیئے بغیر ایک طول طویل تقریر کی۔ اُس نے تمہارے لیے اور ایک اور ملزم ایف تھیریوس ویریواکس (Eleftherious Verivakis) کے لیے سزائے موت کا مطالبہ کیا۔ نکوس (Nikos) کے لیے عمر قید اور باقی تمام ملزمان کے لیے بھاری سزاؤں کا مطالبہ کیا۔ پھر یکا یک مقدمہ کو بظاہر اس بنا پر ملتوی کر دیا گیا کہ ایک جج کو بخار تھا۔ بے چارے ججوں کو اب کچھ علم نہ تھا کہ وہ کیا کریں۔ بس کچھ افواہیں تھیں مثلاً یہ کہ تمہاری تقریر کے بعد کورٹ مارشل کے اراکین میں پھوٹ پڑ گئی تھی۔ حتیٰ کہ خود یاپاپاڈوپاولس بھی تمہیں گولی مار دینے کے فیصلے سے ہچکچا رہا تھا۔ کیونکہ اُسے محسوس ہو گیا تھا کہ اُس کا یہ اقدام اُسے اور زیادہ غیر مقبول بنا دے گا۔ یہ افواہ بھی تھی کہ انتہائی عجلت اور پریشانی میں فوجی جنتا کے اجلاس طلب کیے گئے تاکہ جنرل آئیونیڈیز (Ioannidis) کو تمہاری جان بخشی پر قائل کیا جائے مگر وہ ہر صورت تمہاری جان لینے پر تُلا ہوا تھا اور پھر اتوار، نومبر ۱۷، ۱۹۶۸ء کو فیصلہ کا دن آن پہنچا۔ تم بے حد پرسکون تھے حد درجہ مطمئن اور اِن سات دنوں اور سات راتوں میں تمہیں کوئی دوسرا خیال تک نہ آیا اور اگر آیا بھی تو صرف یہ کہ تم نے کچھ اور زیادہ نہ کہنے پر خود کو ملامت کی اور تم نے موت کی مدح میں ایک نظم کہی:

سفید فاختائیں تو کب کی جا چکیں،/ بھرا پڑا ہے آسمان کووں سے/ سیاہ پرند،/ وحشی دہشتوں کی سرسراہٹیں/ آخری لمحات کی،/ اداسیوں کو ڈھانپتیں/ قبر میں پڑی ہوئی،/ مٹی کے ڈھیر سے/ کہ سفید فاختائیں لوٹ آئیں پھر/ جلدی کر تو اے زمین،/ جلدی کر تو اے زمین/ کہ قبر کو صرف مٹی چاہیے نہیں/ اسے تو اور راکھ،/ اور خون چاہیے،/ اُسے تو موت چاہیے،/ نعش اُس میں ڈال کر/ گوندھ دو مٹی کو/ لہو سرخ سے/ کہ سفید فاختائیں لوٹ آئیں پھر/ اسے بہت سا/ اور خون چاہیے۔

تم کمرۂ عدالت میں اپنے معمول کے مطابق مسکراتے ہوئے اور پورے اعتماد کے ساتھ داخل ہوئے اور جب چیف جج نے کچھ دیر کے بعد تم سے پوچھا کہ تمہیں اپنی صفائی میں کچھ اور تو نہیں کہنا۔ تو تم نے فوراً اُٹھ کر وہ الفاظ ادا کیے جس سے تمہاری کسی قسم کی معافی یا بچت کا رہا سہا امکان بھی جاتا رہا۔ اُس وقت تمہاری آواز میں کسی لرزش کا شائبہ تک نہ تھا۔ ''کورٹ مارشل کے جج، پبلک پراسیکیوٹر لیاپس (Liappis) نے اپنے اختتامی کلمات میں انصاف کی دیوی تھیمیز (Themis) کا حوالہ دیا ہے لیکن جب کبھی ہمیں دیومالا کا حوالہ دینا ہو، تو بنیادی اور فاش غلطیوں سے بچنا چاہیے، لیکن لیاپس تو اپنا منہ کھولتے ہی غلطی پر غلطی کیے جاتا ہے۔ جناب والا آپ کا پبلک پراسیکیوٹر ایک جاہل مطلق ہے، اُسے تو یہ بھی علم نہیں کہ تھیمیز (Themis) نام کی دو دیویاں ہیں انصاف کی ایک دیوی وہ ہے جس کے دائیں ہاتھ میں ترازو اور بائیں ہاتھ میں تلوار ہے اور وہ انتہائی متانت اور پُرسکون انداز میں ترازو پر نظر کیے ہوئے ہے اور پھر

انصاف کی ایک اور دیوی بھی ہے جس کے بائیں ہاتھ میں ترازو اور دائیں ہاتھ میں تلوار ہے۔ اُس کی آنکھوں پر سیاہ پٹی بندھی ہے مگر اُس کی پٹی بندھی نگاہیں تلوار پر ہیں۔ جناب والا، یہ مقدمہ سیاسی بنیادوں پر قائم کیا گیا ہے۔ وہ تمام جرائم جو مجھ سے منسوب کیے گئے، تخریب کاری سے فوجی بھگوڑا ہونے تک، دھماکہ خیز مواد کے قبضے میں ہونے سے لے کر قتل کی کوشش تک، سب اُسی الزام کا حصہ ہیں، جو اپنی اساس میں سیاسی ہے۔ مزید برآں، اے کورٹ مارشل کے بالشتئے جج، تم اگر چاہو بھی تو کسی رحم یا عفو و درگزر کا مظاہرہ کرنے کے قابل نہیں ہو۔ تم میں سے ہر ایک اپریل ۲۱، ۱۹۶۷ء کے واقعات میں ملوث ہے جب فوج نے ایک آئینی اور جمہوری حکومت کا تختہ اُلٹ دیا۔ اگر تم مجھے سزا دینے میں ناکام رہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے اپنا جرم تسلیم کر لیا ہے اور تم خود کو گناہ گار ٹھہرا رہے ہو۔ مجھے سب کچھ واضح طور پر دکھائی دے رہا ہے۔ میں تمہارے آگے حالات کا رونا بھی نہیں روؤں گا اور نہ ہی کوئی ایسی دلیل دوں گا کہ جس سے تم میری سزا کو نسبتاً نرم کرنے پر مجبور ہو جاؤ۔ اس کے بالکل برعکس اور میں یہ بات تمہارے سامنے دوہراتا ہوں کہ میں ہی وہ شخص ہوں جو خود یہ پُرزور مطالبہ کرتا ہے کہ مجھے سزائے موت دی جائے اور جو پبلک پراسیکیوٹر نے بھی کہا ہے۔ ہاں، میں خود اصرار کرتا ہوں کہ مجھے فائرنگ سکواڈ کے سامنے کھڑا کر کے گولیوں سے اُڑا دیا جائے۔ میری موت، اخلاقی طور پر میری جدوجہد کو فتح سے ہمکنار کرے گی اور اسے ایک واضح جواز بخشے گی۔ میری جدوجہد ہر اُس شخص کی جدوجہد ہے جو اس غیر آئینی آمرانہ فوجی حکومت کا مخالف ہے۔ یہ فوجی ٹولہ، جو ہمارے وطن عزیز یونان کو بُری طرح تباہ و برباد کر رہا ہے۔''

اور پھر عدالت نے اپنا فیصلہ سنا دیا: ریاست کے خلاف تخریب کاری کا الزام ثابت ہونے پر سزائے موت، فوجی بھگوڑا ہونے پر سزائے موت، ریاست کے چیف ایگزیکٹو کو ہلاک کرنے کی کوشش پر پندرہ برس کی قید بامشقت، دھماکہ خیز مواد کو ذاتی قبضہ میں رکھنے پر تین برس کی قید سخت، علاوہ ازیں توہین عدالت و توہین افسران مجاز پر دو برس کی قید سخت۔ میزان: دو بار سزائے موت، بیس برس سے زائد قید بامشقت، ویریواکس کے لیے جس دوام اور دیگر ملزمان کے لیے چار سے چوبیس برس کی قید بامشقت جنرل فیڈوگزیکس (Phaedo Gizikis) کمانڈر ایتھنز پریزیڈیم نے اِن سزاؤں پر عمل درآمد کے لیے فی الفور دستخط کر دیئے۔

☆☆☆

غزلیات

ڈاکٹر خیال امروہوی

سکونِ دل کی ہلاکت ہے انتظار ترا
جلا کے خاک نہ کر دے کہیں شرار ترا

غرور جبہ کو ریشم اڑھائے پھرتا ہے
کبھی کبھار خجالت سے انکسار ترا

ہمیں تو کیف تصور پہ ٹال رکھا ہے
وگرنہ جام ترے ، مے تری خمار ترا

جو لوگ کرب میں بے اختیار جیتے ہیں
کہیں جھپٹ کے نہ لے جائیں اختیار ترا

فغاں کے ساتھ برسنے دلے آنکھ کا بادل
ملے گا عہد شگفتہ پسِ غبار ترا

ابھی تو ہوش نہیں ہے فقیر زادوں کو
یہی وہ ہیں جو کریں گے کبھی شکار ترا

امید صبح مکافات کے تصور میں
ہمیں تو شہد لگا طرز ناگوار ترا

گزر رہے ہیں ہم اس عہد بے محبت سے
کہ جس میں آن ہماری نہ کچھ وقار ترا

ڈاکٹر خیال امروہوی

جبیں کو واقف صد انفعال کیا کرتے
جو خود گدا ہو ہم اس سے سوال کیا کرتے

جو عصر نو میں قدامت پہ جاں چھڑکتے ہوں
وہ بے شعور ہمارا خیال کیا کرتے

جہاں عذاب جرائم کمال رحمت ہو
وہاں پہ چند ستودہ حضال کیا کرتے

زہے نصیب کہ جیبیں تو کات لیتے ہیں
وگرنہ بھوک میں اہل و عیال کیا کرتے

جسے ہر آن نئے ذائقے کی خواہش ہو
ہم اس سے عرضِ عطائے وصال کیا کرتے

بلا دلیل گلا گھونٹتے ہیں مکتب کا
اب اور اہل طریقت کمال کیا کرتے

بلند بانگ گروہی ادب کی پورش میں
تمہیں بتاؤ جنابِ خیالؔ کیا کرتے

غزلیات

پرویز ساحرؔ

تجھ کو معلوم کہاں ، حَرف کے اِعجاز کا رنگ
تُو نے دیکھا ہی نہیں ہے کبھی آواز کا رنگ

چاہے تُو لاکھ اُسے مجھ سے چھُپائے لیکن
صاف دِکھتا ہے ترے رُخ سے ترے راز کا رنگ

مَیں کہ اَفلاک کی حَدّوں کو چُھوا چاہتا ہوں
کھول مجھ پر اے خدا! شعلۂ پرواز کا رنگ

اِس لیے آج اُسے دیکھ کے حیران ہوں مَیں
بدلا بدلا تھا رُخِ یارِ دَغا باز کا رنگ

کاش تُو بھی کِرہِ سِرِّ معانی کھولے
کاش ظاہر ہو کبھی تجھ پہ بھی الفاظ کا رنگ

ہر طرف شہر میں چرچا ہے مِرے شعروں کا
ہر طرف شہر میں چھایا ہے مِرے ساز کا رنگ

یوں تو دنیا میں کئی رنگ ہیں اچھے ساحرؔ
مجھ کو بھاتا ہے مگر اور ہی انداز کا رنگ

سجاد مرزاؔ

بہت صدیاں لگی ہیں اشک کو گوہر بنانے میں
یونہی حاصل نہیں ہوتا ہنر کوئی زمانے میں

گھڑی بھر کی رفاقت سے نہ کوئی فیصلہ کرنا
کہ عمریں بیت جاتی ہیں، کسی کو آزمانے میں!

سخن فہمی کا دعویٰ ہے جنہیں، ان کو ذرا دیکھو
لگے ہیں وہ زمینِ شعر کی مٹی اُڑانے میں!

کسی سورج، کسی مہتاب سے مانگی نہیں کرنیں
مرے افکار نے روشن کیا مجھ کو زمانے میں

شکایت کیا کریں، کس سے کریں، گھر کی تباہی کی
سبھی اپنے تھے شامل آگ اس گھر کو لگانے میں

جہاں میں تم سے بڑھ کر بھی شکستہ دل بہت ہوں گے
مگر تم تو مُصِر ہو داستاں اپنی سنانے میں

ذرا دم سادھ کر سجاد مرزا گفتگو کرنا
بھلا کب دیر لگتی ہے دلوں کے ٹوٹ جانے میں!

غزلیات

فہیم شناس کاظمی

اب زمانے میں نہیں کوئی نہیں ہم جیسا
کون سہہ پائے گا یاں ہم نے سہا غم جیسا

لمحۂ وصل میں دم بھر کو ٹھہرتے کیسے
ہو سکونت کا بھی انداز اگر رم جیسا

اس زمانے میں کوئی غم نہیں محرومی سا
اس زمانے میں کوئی نشہ نہیں غم جیسا

ایسا برسات کے موسم میں بھی ناممکن ہے
تشنہ رہ کے بھی میں دریا کو رکھا نم جیسا

اتنے غصے میں انہیں پہلے کہاں دیکھا تھا
اب کے انداز ہواؤں کا ہے برہم جیسا

اس کے لہجے کی گھلاوٹ میں عجب تلخی ہے
ذائقہ آبِ رواں کا بھی لگے سم جیسا

خیمۂ خواب میں آنکھیں بھی جلیں ہیں میری
اب تو ہر لمحہ ہوا عرصۂ ماتم جیسا

رسا چغتائی

نکل کر سایۂ ابرِ رواں سے
رہے ہم مدتوں بے سائباں سے

زمیں پر چاند آیا چاہتا ہے
اُتر کر کشتیِ آبِ رواں سے

نگاہیں ڈھونڈتی ہیں رفتگاں کو
ستارے ٹوٹتے ہیں آسماں سے

مناتے خیر کیا ہم جسم و جاں کی
اُسے چاہا تھا ہم نے جسم و جاں سے

رسؔا کس عہدِ نا پُرساں میں ہم نے
لیا ہے کام حرفِ رائگاں سے

غزلیات

قاضی حبیب الرحمٰن

وہ زمیں ہے کہ آسماں کوئی
ایک چکر ہے جاوِداں کوئی

لمحہ لمحہ سُلگ رہا ہے دِماغ
ذرّہ ذرّہ ہے چیستاں کوئی

اپنے ہی ورطۂ تحیّر میں
ڈوبا جاتا ہے خاکداں کوئی

یا ملے ساحلِ مراد - کہیں
یا تمنا کا بادباں کوئی

مَیں کسی اور کی تلاش میں تھا
آ گیا بیچ - ناگہاں کوئی

سربسر - کھلتے منظروں کی بہار
اے خوشا - رقصِ گمرہاں کوئی!

نشۂ ذات میں چھلکتا ہوا
قطرہ ہے بحرِ بیکراں کوئی

آخِرش ، بے جہت بنا دے گا
ہر جہت پھیلتا جہاں کوئی

جیسے سونا پڑا دمکتا ہے
دل کے اندر ہے ضَوفشاں کوئی

اپنی مٹی کے حسن و قبح سمیت
یاد آتا ہے ۔۔۔ دوستاں ، کوئی

رات کے نیم وَا تناظر میں
سوچتا ہے دُھواں دُھواں کوئی

صرف اور صرف ، ایک خالی عکس
آئنہ ہے کہ لامکاں کوئی

دیکھنے کی ہوس میں کھو بیٹھے
بند آنکھوں میں تھا سماں کوئی

وجہِ شہرت ہے اپنی بے ہنری
بے نشانی بھی ہے نشاں کوئی

وہ تو کہیے کہ مر گئے ، ورنہ
زندہ رہنے میں تھا زیاں کوئی

ناز کو بھی نیاز لازم ہے
تیر کو چاہیے کماں کوئی

بچ نکلتا جو اپنے خنجر سے
ایسا ہشیار تھا کہاں کوئی

سب کو معلوم ہے یہ رمزِ خفی
اک بہانہ ہے امتحاں کوئی

کھول رکھی ہے ، اک مسیحا نے
کُو بہ کُو - درد کی دُکاں کوئی

شبِ ہجراں میں روز لکھتا ہے
خطِ مژگاں میں - کہکشاں کوئی

جانتا ہوں کہ رایگاں ہے مگر
ہائے - تسکینِ رایگاں کوئی!

رات کٹ جائے گی ، ذرا اے دل!
اگلے وقتوں کی داستاں کوئی!

خیمۂ جاں کی اوٹ پھرتا ہے
ہر زماں - صورتِ گماں کوئی

فاصلے ہیں کہ کم نہیں ہوتے
ہے ازل سے رواں دَواں کوئی

منزلِ شوق ، ایسی دور نہیں
دشت پڑتا ہے درمیاں کوئی

چاپ سی اک سنائی دیتی ہے
دل سے گزرا تھا کارواں کوئی

کِن جزیروں میں پھنس گئے ، آ کر
ہم سخن ہے نہ ہم زباں کوئی

پرِ پرواز بن گئے - آخر
ضُعفِ ہمت سے ، آشیاں کوئی

دھوپ نکلی ہے بے سرو ساماں
تپتے صحرا میں - سایباں کوئی!

ہر نفس - درد بن کے اُٹھتا ہے
دل میں بیٹھا ہے مہرباں کوئی

آخرِ شب کی خاموشی میں حبیب
گونجتا ہے - زماں زماں کوئی

قاضی حبیب الرحمٰن

اُڑائے پھرتا ہے کیا کیا خیال کا نشہ
ٹھہرنے دیتا نہیں اُس غزال کا نشہ

اُبھر رہا ہے تصور میں کوئی پیکرِ ناز
نکھر رہا ہے سرِ خط و خال کا نشہ

گلِ نشاط ، سرِ شاخِ غم ، کھلا دیکھا
شرابِ ہجر میں پایا ، وصال کا نشہ

بندھا ہے یہ جو چمن در چمن، طلسمِ بہار
چڑھا ہے اصل کو اپنی مثال کا نشہ

کہاں زمین؟ کہاں آسماں؟ تماشا ہے
خُمِ عروج سے نکلا زوال کا نشہ

کوئی بھی صورتِ امکاں ہو، دل بہلتا نہیں
اِس آئنے کو ہے عکسِ محال کا نشہ

حریفِ بادۂ فطرت ہوں مَیں ازل سے حبیب
مرے سبو میں ہے آبِ زُلال کا نشہ

غزلیات

کاشف حسین غائرؔ

آ کبھی شام کے علاوہ بھی
مل کبھی کام کے علاوہ بھی

دامنِ دشت میں بہت کچھ ہے
گردِ ایام کے علاوہ بھی

ایک کردار ہے کہانی کا
آدمی نام کے علاوہ بھی

کوئی منظر ہو دیکھنے کے لیے
ان در و بام کے علاوہ بھی

کیا نہیں زندگی بہت کچھ ہے
اپنے انجام کے علاوہ بھی

دل کا اپنا بھی ایک موسم ہے
رنج و آلام کے علاوہ بھی

اور کچھ یاد رہے تجھے غائرؔ
یاد اُس نام کے علاوہ بھی

شاہد ملک

عجیب لگتا ہے گفت و شنید کرتے ہوئے
ترے سوا کسی چہرے پہ دید کرتے ہوئے

نہ پوچھو کیسی قیامت گزر گئی مجھ پر
تمہارے بعد محبت مزید کرتے ہوئے

اِسی زمین پہ مقتل سجاؤں گا اپنا
یہ میں نے سوچا ہوا تھا خرید کرتے ہوئے

چراغ مجھ کو بجھانا پڑا تھا کمرے کا
کچھ اور پیار کی لَو کو شدید کرتے ہوئے

ہم اپنے کام میں لاتے ہیں ترے ہجر کے زخم
زبان و لہجہ و فن کو جدید کرتے ہوئے

وہ جب کہ پاس ہمارے تمہاری راتیں تھیں
ہمارے دن بھی گزرتے تھے عید کرتے ہوئے

نشے سے میرا بدن چُور ہو گیا شاہدؔ
شراب اُس کے لبوں سے کشید کرتے ہوئے

غزلیات

عطاء الرحمٰن قاضی

بکھر بکھر سے گئے جسم و جاں ، چراغ جلے
سو چھڑ گئی ہے نئی داستاں ، چراغ جلے

قدم قدم پہ ہے عفریتِ قیر گوں رقصاں
یہ چل دیے ہو کدھر کو ، میاں! چراغ جلے

مسافرانِ رہِ آرزو بھی آخرِ کار
تلاش کرنے لگے سائباں ، چراغ جلے

نہ آئے لوٹ کے پھر طائرانِ دشتِ خیال
پکارتے ہی رہے آشیاں ، چراغ جلے

الجھ پڑا ہے ستاروں سے پھر دوانہ ترا
زمیں پہ گر نہ پڑے آسماں ، چراغ جلے

نکل پڑا ہوں کسی خواب کے تعاقب میں
میں لے کے یادوں کی اک طیلساں، چراغ جلے

اتر پڑی ہے مرے دل کے آئینے میں عطاؔ
مہکتے رنگوں کی اک کہکشاں ، چراغ جلے

محمد فیروز شاہ

ہمارا منصب تھا گل رتوں کی روایتوں کو سنبھال رکھنا
مگر ہمیں بھی ہے اب خزاں کی وراثتوں کو سنبھال رکھنا

کبھی جو تاریخِ شب لکھو تو یہ سچ کی عینی شہادتیں ہیں
ہمارے بے انت رتجگوں کی امانتوں کو سنبھال رکھنا

منافقت کے محاصرے میں مرا گھروندا بھی آ گیا ہے
مجھے تو ہرگز نہ راس آیا رفاقتوں کو سنبھال رکھنا

ہم اپنی نسلوں کے واسطے کوئی سرخروئی تو چھوڑ جائیں
لہو سے لکھے ہوئے دنوں کی عبارتوں کو سنبھال رکھنا

ہماری عمریں تو برف باری کی یخ رتوں میں بکھر رہی ہیں
اس آزمائش میں تم اَنا کی تمازتوں کو سنبھال رکھنا!

احمد صغیر صدیقی

غزل

کوئی زخم بھی اِس سے بڑھ کر نہیں
چلے تھے مگر مثلِ خنجر نہیں

ذرا دیکھئے کیسا منظر ہے یہ
کہیں سامنے کوئی منظر نہیں

کریں سب کو گردن سے نیچے تلاش
کہ سب جسم ہی جسم ہیں ، سر نہیں

یہ غم کم ہے کیا ڈوبنے کے لیے
میں دریا ہوں بس اک ، سمندر نہیں

تہہِ خاک کب سے پڑے ہیں خموش
پکاریں کسے کوئی اوپر نہیں

کہاں دستکیں دے رہے ہو ، یہاں
کوئی آج کل اپنے اندر نہیں

احمد صغیر صدیقی

''فاعتبرو۔۔۔''

بہت بولتے تھے
کہا کرتے تھے بولنا لازمی ہے
کہا کرتے تھے بولتے ہیں وہی جن کے اذہان زرخیز ہیں
جن کی سوچوں کے کیسے
پُراسرار لفظوں
کھنکتی صداؤں
فروزاں نواؤں سے لبریز ہیں
مگر اب
کبھی بھی نہیں بولتے ہم
لبوں پر ہے اک خامشی
قفل کی طرح لٹکی ہوئی
جس کے پیچھے
صدائیں، نوائیں
اور الفاظ
احساس کی کوٹھڑی میں
سزا یافتہ قیدیوں کی طرح سڑ رہے ہیں
ہوا کیا تھا
بس یہ ___ کہ اک دن
سرِ منبر مسجدِ علم و حکمت
عبا و قبائے شکوہِ تکلّم میں ملبوس
اک مفتیِ برگزیدہ کی تقریر سُن لی تھی ہم نے

خالد ریاض خالدؔ

روشنی کی بھیک

چیونٹیوں کی طرح رینگتے ہوئے
انسانی جوسوں کا مقدر بناتیں حویلیاں
سفید کاغذ پہ، کالے قلم سے لکھے فیصلے
دیوار پہ دستک دیتی ہوئی آوازیں
کھوٹ اُگلتا ہوا احساس کا ترازو
چہروں پہ حیرانی کی بارش
بہت دُور تک سایہ نہیں
آنے والی نسل
ابھی سے اندھیری غار کے دہانے پر کھڑی
تصور میں روشنی کی بھیک مانگتی ہے

خالد ریاض خالدؔ

پرندوں کی آنکھوں میں

وقت کا سانپ
لال زبان پر، فریب کے سبز پتے رکھے
کنڈلی مارے بیٹھا ہے
اس کے قریب مت جانا
یہ آدھی زندگی نگل لیتا ہے
اور آنسوؤں کے ریوڑ
خواہشوں کے سونے جنگل میں
پرندوں کی آنکھوں میں حنوط کر دیتا ہے

حروفِ زر

(قارئین کے خطوط)

سلام مسنون۔ ''انگارے'' کی ۱۱ویں کتاب مل گئی ہے۔ آپ کا شکر گزار ہوں۔

اس پرچے میں حکومتی اور ذاتی سطح پر ترجیحات کی تبدیلی پر آپ نے مدلل اداریہ لکھا ہے اور اس قومی زبان کا ذکر بے حد دردمندی سے کیا ہے جس کا پوری قوم کو شکار بنایا جا رہا ہے۔ یہ بات درست ہے کہ ایک دور میں تعلیم، فکر وفن اور سماجی علوم کو فوقیت حاصل تھی۔ ان کا حصولِ کامل فکر وخیال کو منور کر دیتا اور ذہنی بالیدگی کا سبب بن جاتا تھا۔ مجھے اپنے بچپن میں ایسے متعدد بزرگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے جن کی تعلیم مسجد کے مدرسے تک محدود تھی لیکن ان کا ذوق وشوق اس مقام تک پہنچ گیا تھا کہ حافظ، رومی اور اقبال پر بحث کرتے۔ ان بزرگوں نے اپنے بچوں کو ''دو پیسے'' کی مزدوری پر نہیں لگایا، علم کی دولت سے سرفراز کیا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اگر تعلیم عام ہو تو انسان کی ذہنی ترقی کی راہیں کھل جاتی ہیں اور وہ اپنی ترجیحات بھی خود مقرر کرنے کی صلاحیت حاصل کر لیتا ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی اور کمپیوٹر لٹریسی وغیرہ اس دور کی ایجادات ہیں، جن سے اغماض ممکن نہیں۔ تاہم ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ابتدائی تعلیم کے بغیر ہی سائنس اور ٹیکنالوجی کو فروغ دینے کی سعی ہو رہی ہے۔ اور اب جو المیہ ظاہر ہو رہا ہے اس کا اظہار آپ نے اداریے میں دوٹوک الفاظ میں کر دیا ہے:

> ''وہ مغربی اثرات جنہیں رفتہ رفتہ اس معاشرے کے ساتھ ہم آہنگی کرنی تھی
> اب ایک بے ربط اور اندھی صورتِ حال کے ساتھ ہماری ذہنی اور ثقافتی اکائی
> توڑنے لگے ہیں۔''

اور نتیجہ بھی سامنے آ رہا ہے کہ

> ''عام طلبا کی توجہ سماجی علوم سے بالکل ہٹ گئی ہے۔''

بلاشبہ یہ ایجنڈا حکومتی سطح پر بھی اور انفرادی طور پر بھی مغرب کی اندھا دھند تقلید پر مبنی ہے۔

''انگارے'' کی ۱۱ویں کتاب میں ڈاکٹر روبینہ ترین نے فراق گورکھپوری کو ان کی اپنی تحریروں سے دریافت کرنے کی عمدہ کاوش کی ہے۔ ان کا طریقِ عمل یہ ہے کہ وہ پہلے فراق کے بارے میں ایک موقف مرتب کرتی ہیں اور پھر اس کا اثبات ان کی اپنی تحریروں سے کرا دیتی ہیں۔ یہ مضمون فراق کی اپنی شہادتوں سے مرّصع ہے اور اہم بات یہ کہ ان کے بارے میں مثبت تاثر پیدا کرتا ہے۔ یہاں مجھے اپنی اس مسرت کا اظہار بھی کرنا ہے کہ بہاء الدین زکریا یونیورسٹی اب تحقیق وتنقید کا ایک مضبوط مرکز بنتا جا رہا ہے۔ میں نے روبینہ ترین صاحبہ کو ڈاکٹر اے بی اشرف اور ڈاکٹر انوار احمد کی نگرانی میں کام کرتے ہوئے دیکھا

تھا، اب وہ خود کئی اچھے موضوعات پر تحقیق کرا رہی ہیں اور ادیبوں کی ایک نئی کہکشاں مرتب کرنے کی بھی سعی کر رہی ہیں۔ شاعری کے حصے میں قیوم طاہر کی ''غزل'' کا مقطع بڑا معنی خیز ہے۔ اس کی سیاسی جہت فوراً متوجہ کر لیتی ہے۔

> مجھ کو دشمن نے کہاں آدھا کیا ہے قیوم
> میرا دشمن ، مرا رہبر بھی تو ہو سکتا ہے

اشارہ سقوط ڈھاکہ کی طرف ہے تو ہمارا ''دشمن'' کبھی ''رہبر'' بنتا نظر نہیں آتا بلکہ وہ ہمارے مزید ٹکڑے کرنے کے درپے ہے۔ پرویز ساحر کی غزل میں عجب بے ساختگی نظر آئی، عطاء الرحمان قاضی اور منیر عصری کے تیور تیکھے اور متاثر کرنے والے ہیں۔ میری ان سے پہلی ملاقات ہوئی ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ لکھنے والوں کا تعارف دو چار سطروں میں کروا دیا کریں، الٰہ آباد کے رسالہ ''شبِ خون'' میں شمس الرحمان فاروقی نے یہ سلسلہ اس رسالہ کے اجراء سے شروع کر رکھا ہے۔ ''نئی تحریریں'' میں قیوم نظر صاحب بھی پاورق؟؟؟ میں تعارف کرا دیتے تھے۔

''انگارے'' میں میرا مکتوب دربارہ احمد ندیم قاسمی چھاپ کر آپ نے حقیقت حال قارئین تک پہنچانے میں میری معاونت کی۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں، یہ خط لکھتے وقت میرا خیال تھا کہ احمد ندیم قاسمی اتنے غیور اور خوددار ہیں کہ وہ ٹوٹ سکتے ہیں، جھک نہیں سکتے۔ معاشرے میں ان کا اپنا ایک مقام ہے جس کے اوج کو سرکاری افسران حسرت سے دیکھتے دیکھتے رزقِ خاک ہو جاتے ہیں، مجلس ترقی ادب سے ان کا استعفیٰ ان کی عظمت کا نشان تھا جس کی حفاظت انہوں نے بیوروکریسی کے سامنے اپنا سر بلند رکھ کر اور ٹھیکے کی ملازمت کو جوتی کی نوک پر رکھ کر کی۔ اب یہ خبر بھی سن لیجیے کہ انہوں نے وزیر اعلیٰ پنجاب کے دفتر میں حاضر ہو کر اپنی سرکاری نوکری میں توسیع حاصل کر لی ہے۔ اندازہ لگائیے کہ ان کی سفارش کے لیے جناب عطاء الحق قاسمی، جناب منو بھائی اور جناب عبدالقادر حسن ان کے ساتھ گئے۔ ان کے خلاف مبینہ بدارتکابی اور بدعنوانی کی جو ''انکوائری'' ہو رہی ہے، وہ شاید داخل دفتر ہو گئی ہے۔ انہوں نے جو استعفیٰ دیا تھا، اس پر اب عمل درآمد نہیں ہوگا۔ بلکہ قاسمی صاحب کی تنخواہ میں بھی اضافہ کر دیا گیا ہے۔ اب وہ حسبِ سابق ''دو پیسے'' کا کام کریں گے۔

مولانا محمد حسین آزاد نے آبِ حیات ''میں لکھا ہے کہ دہلی کالج میں فارسی مدرس کے تقرر کے لیے سب سے پہلے مرزا غالب کو بلایا گیا۔ ''مرزا پالکی پر سوار ہو کر صاحب سیکرٹری کے ڈیرے پہنچے۔ صاحب کو اطلاع ہوئی۔ انہوں نے فوراً بلا لیا۔ مگر یہ پالکی سے اتر کر اس انتظار میں ٹھہرے رہے کہ دستور کے موافق سیکرٹری صاحب ان کے لینے کو آئیں گے۔ جب بہت دیر ہو گئی اور صاحب کو معلوم ہوا کہ اس سبب سے نہیں آئے، وہ خود باہر چلے آئے اور مرزا سے کہا جب آپ دربارِ گورنری میں تشریف لاویں گے تو آپ کا استقبال اسی طرح سے کیا جاوے گا۔ لیکن اس وقت آپ نوکری کے لیے آئے ہیں اس موقع پر وہ برتاؤ نہیں ہو سکتا۔ مرزا صاحب نے کہا ''گورنمنٹ کی ملازمت کا ارادہ اس لیے کیا ہے کہ اعزاز کچھ

زیادہ ہو، نہ اس لیے کہ موجودہ اعزاز میں بھی فرق آئے۔ صاحب نے کہا ہم قاعدے سے مجبور ہیں۔ مرزا صاحب نے کہا ''مجھ کو اس خدمت سے معاف رکھا جائے'' اور یہ کہہ کر چلے آئے۔

بعض معیاروں کے اعتبار سے احمد ندیم قاسمی کو بعض لوگ غالبؔ، اقبالؔ اور فیضؔ سے بڑا قرار دیتے ہیں لیکن افسوس کہ وہ غالبؔ کے معیار تک نہ پہنچ سکے اور ''سگِ دنیا'' بن گئے۔ انہوں نے عنفوانِ شباب میں سرکاری ملازمت پر تین حرف بھیجے تھے تو کرشن چندر نے لکھا تھا

''آبکاری سے بیکاری بھلی۔''

اب کرشن چندر زندہ ہوتے تو ہرگز یہ نہ کہتے کہ

''بیکاری سے مجلس ترقی ادب کی نوکری بھلی۔''

ذاتی طور پر مجھے افسوس یہ ہے کہ میں نے ان کی عظمت کو سربلند کرنے کے لیے اِن کے شایانِ شان جس تحریک کا آغاز کیا تھا اب وہ غیر طبعی موت مرگئی ہے۔

''وائے'' ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا''

میری طبیعت ۷۵ویں سال کے آغاز میں بہت خراب ہوگئی تھی، اظہر جاوید صاحب نے اس کی خبر رسالہ ''تخلیق میں شائع کر دی۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے جاپان سے اور ممتاز راشد صاحب کے علاوہ ڈاکٹر حسین احمد پراچہ نے دوحہ (قطر) اور سعودی عرب سے بھی چند موثر ادویات بھیجی ہیں، ان کے استعمال سے کچھ کام کرنے کے قابل ہوسکا ہوں اور آپ کو خط لکھ رہا ہوں۔

(ڈاکٹر انور سدید۔ لاہور)

''انگارے'' گیارہویں کتاب کا تحفہ موصول ہوا۔ شکر گزار ہوں۔ آپ کا اداریہ خیال افروز ہے۔ کم لفظوں میں بہت سے مسائل کو چھیڑتا ہوا یہ معاملہ حکومتی سطح پر سوچنے والا ہے۔ عام آدمی یہی کرسکتا ہے کہ اپنے بچوں کو اپنی بنیادی اقدار سے رُوشناس کرانے کا خود انتظام کرے۔

حمایت علی شاعر صاحب نے ظہیر کاشمیری پر مضمون لکھ کر ہم سب کی طرف سے ایک فرض ادا کیا ہے۔ واقعی ہم لوگوں کا حافظہ بہت کمزور ہے۔ کیسے اچھے اچھے لوگوں کو لوگ کس طرح فراموش کرتے ہیں، دیکھ کر دکھ ہوتا ہے۔ دیگر مضامین بھی اچھے ہیں خصوصاً ڈاکٹر روبینہ ترین کا مضمون۔ سلسلہ وار ناول اچھا جارہا ہے۔ عمدگی سے لکھا ہوا ہے۔ شاعری کا حصہ پہلے سے زیادہ ہے مگر خوش نہیں کرسکا۔

خطوط میں قاضی جاوید کا خط حیرت کا باعث بنا جنہوں نے ''انگارے'' (۱۰ویں کتاب) میں چھپی شاعری کو بالکل ہی مسترد کر دیا۔ کیا ہی اچھا ہو کہ وہ اس شاعری پر کوئی مضمون لکھیں جو ان کے خیال میں عمدہ کہی جاسکتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ آج کل زیادہ تر شاعری کمزور ہورہی ہے مگر اِس میں کہیں کہیں اچھی کوششیں بھی ہوتی ہیں کم از کم انہیں تو سراہنا ہی چاہیے۔

(احمد صغیر صدیقی۔ کراچی)

''انگارے'' کا گیارہواں شمارہ اپنی رعنائیوں اور حدتوں کے ساتھ سرد دوپہر میں موصول ہوا۔ اس کی بروقت اور مسلسل اشاعت ہمارے لیے اچنبھے کی بات ہے۔ حمایت علی شاعر اور ڈاکٹر انور سدید کی تحاریر اعترافِ ذات وفن پر مشتمل تھیں۔ اصغر علی شاہ اور روبینہ ترین کے مضامین تعارفیہ طرز کے تھے۔ شوکت نعیم نے اپنی تحریر میں جس بات کی طرف توجہ دلائی ہم اس سے کافی حد تک متفق ہیں۔ ابنِ حسن کا تحریر کردہ مقالہ اِس شمارے کا حاصل مطالعہ ہے، اختلافی باتوں کے باوجود ہم اُن کے معترف ہیں۔ اس موضوع پر مزید بحث کی ضرورت ہے۔ شاعری میں قیوم طاہر، عطاء الرحمٰن قاضی (دوسری غزل) اور منیر عصری (پہلی غزل) کی شاعری پسند آئی۔ شانی فریاد کی نظم احساس، احساس سے بھرپور تھی۔ حروفِ زر، میں اِس بار انور سدید اور احمد صغیر صدیقی کے خطوط خصوصیت کے حامل تھے۔ احباب کے ناموں میں تقریریں چھٹنے لگی ہیں جو ایک خوش آئند بات ہے۔

(پرویز ساحرؔ۔ ایبٹ آباد)

''انگارے'' کے تسلسل پر مبارک باد۔ گذشتہ شمارے میں اصغر علی شاہ کا مضمون اور رانی آکاش ہاشمی کا افسانہ خاصے کی چیز تھی۔ خالد سعید کے ترجمے سے محظوظ ہورہا ہوں کہ وہ جہاں کہیں بھی علاقائی زبانوں کے نسل ہا دیدہ وشنیدہ الفاظ لاتے ہیں، وہ جگہ روشن ہوجاتی ہے۔ گذشتہ شمارے میں ڈاکٹر انور سدید کا خط قدرے تاسف اور عبرت کے ساتھ پڑھا۔ خدا ایسی لڑائیوں سے محفوظ رکھے جو ضعفِ پیری میں بھی انسان کو سکھ کے سانس گوارا نہیں ہونے دیتیں۔ ڈاکٹر خیال امروہوی کی تخلیقات کا احترام کیجیے کہ ''انگارے'' والوں میں اک یہی بچا ہے۔

(خالد محمود سنجرانی۔ لاہور)

''انگارے'' میں حمایت علی شاعرؔ صاحب مسلسل اُردو زبان کے بارے میں اظہارِ خیال فرما رہے ہیں اور پڑھنے والوں میں اس موضوع سے متعلق لکھنے کی تحریک بھی پیدا کررہے ہیں۔ ''اکتوبر'' کے شمارہ میں انہوں نے اُردو کے بارے میں جہاں اور بہت سی خیال افروز باتیں کیں وہاں اُردو کے رسم الخط کے بارے میں یہ کہہ کر نئے سرے سے اس بحث کو چھیڑا ہے کہ ''ہندوستان میں اردو 'ہندی' کے نام اور اُس کے رسم الخط دیوناگری کے لباس میں زندہ ہے۔ اُردو رسم الخط جو فارسی سے ماخوذ ہے، فارسی کی طرح رفتہ رفتہ محدود ہوتا جارہا ہے۔۔۔ اور اِس (اُردو) میں فارسی اور عربی کے عام فہم الفاظ بھی زندہ ہیں لیکن وہ اب ہندوستانی لباس پہن چکے ہیں۔ ہندوستان کی کم وبیش ساری زبانیں دیوناگری میں لکھی جاتی ہیں۔ ہندی کی معرفت اُردو بھی اِسی لباس میں زندہ رہے گی۔''

یہ بحث بہت پرانی ہے جو وقتاً فوقتاً سر اٹھاتی رہی ہے اور اب محسوس ہوچلا تھا کہ اس مسئلے کا حل تلاش کرلیا گیا ہے مگر شاعرؔ صاحب کے مندرجہ بالا اس بیان سے معلوم ہوا کہ یہ بحث ابھی کسی ٹھوس نتیجے پر نہیں پہنچ سکی۔

اگر ایک طرف اُردو کے لیے فارسی رسم الخط کو موزوں قرار دینے والا طبقہ موجود ہے تو دوسری طرف دیوناگری خط کو اُردو کی بقاء کا ضامن خیال کرنے والا گروہ بھی موجود ہے جبکہ تیسری طرف ایک گروہ رومن رسم الخط کی تجویز کو بڑی شدومد کے ساتھ پیش کرتا ہے۔

لیکن اکیسویں صدی میں اب ہمیں کسی حتمی فیصلے تک پہنچ جانا چاہیے۔ اپریل ۱۹۹۵ء کے ''صریر'' کے اداریے میں بھی ''فہیم اعظمی'' صاحب نے حسن چشتی'' صاحب کا وہ خط شائع کیا تھا۔ جس میں انہوں نے شکاگو میں منعقد ہونے والے جلسہ کا ذکر کیا، جس میں جناب ''ہاشم علی اختر'' صاحب نے اپنے خطبہ صدارت میں یہ بات کہی کہ ''اُردو لکھنے والوں کی تعداد روز بروز گھٹتی جارہی ہے لیکن اُردو بولنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہورہا ہے۔'' اور پھر انہوں نے مشورہ دیا کہ ''اگر اُردو کو زندہ رکھنا ہے تو ہم کو ہندوستان میں اُردو کو دیوناگری میں اور مغرب میں اس کی ترویج کے لیے رومن رسم الخط میں لکھنا ہوگا۔'' اور ساتھ ہی انہوں نے اس مسئلے پر غور کرنے کی پیش کش بھی کی۔

مجھے شاعرؔ صاحب کی اس بات سے صدفی صد اتفاق ہے کہ ''رسم الخط کے لیے کسی تعصّباتی حمایت سے تو گریز ہی کرنا چاہوں گا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اُن مسائل کا بھی ٹھوس حل چاہتا ہوں جن کا ذکر فارسی رسم الخط کے طرف دار، دیوناگری رسم الخط اپنائے جانے کے ضمن میں کرتے ہیں۔

سب سے پہلے اُن کا کہنا یہ ہے کہ اردو رسم الخط محض فارسی خط نہیں بلکہ یہ فارسی اور ہندی دونوں کے حروف تہجی پر مشتمل ایک مخلوط رسم الخط ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس میں دیگر تمام زبانوں کی بہ نسبت زیادہ آوازوں کو ادا کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ کیا یہ درست ہے؟

اسی کے ساتھ، یہ اعتراض بھی موجود ہے کہ دیوناگری خط خالص سنسکرت سے ماخوذ ہے۔ یہ صرف سنسکرت کی ضروریات کو مکمل طور پر پورا کرتا ہے اور اس رسم الخط میں سنسکرت کے علاوہ دوسری زبانوں کے الفاظ کی آمیزش کی گنجائش بہت کم ہے۔ جبکہ ہندوستان و پاکستان میں موجودہ صورتِ حال یہ ہے کہ جو زبان یہاں بولی جاتی ہے ایک مخلوط زبان ہے جو عربی، فارسی، انگریزی، سنسکرت پرتگالی وغیرہ سبھی زبانوں سے مل کر تیار ہوئی ہے۔ اگر یہ درست ہے تو پھر کیا یہ مناسب نہیں ہوگا کہ اس کے لیے ایک ایسا رسم الخط اختیار کیا جائے جو فارسی، عربی، سنسکرت سبھی حرفوں سے مل کر تیار ہوا ہے؟ اُردو چونکہ محض فارسی رسم الخط نہیں بلکہ مخلوط رسم الخط ہے تو کیا مخلوط زبان اور مخلوط قوم کے لیے یہ مخلوط رسم الخط زیادہ موزوں نہیں؟ اور اگر دیوناگری خط اپنا لیا جاتا ہے تو فارسی اور عربی کے وہ الفاظ جو اُردو زبان میں رچ بس گئے ہیں، کیا اس خط میں اُسی معنویت کے ساتھ اجاگر ہوسکیں گے، جس معنویت سے اُردو خط میں ہوتے ہیں؟

اب میں ''گوپی چند نارنگ'' صاحب کے حوالے سے بات کو آگے بڑھاؤں گا، جنہوں نے اُردو اور ہندی کو ارتقا کے حوالے سے دو مختلف زبانیں قرار دیا ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ ''اُردو اور ہندی کی بنیاد ایک ہے لیکن ارتقائی صورتیں مختلف ہیں اور ارتقائی سفر میں یہ دونوں زبانیں اتنی آگے بڑھ چکی ہیں کہ

اب ان کے لیے ایک ہی رسم الخط کا تجویز کرنا دونوں کے حق میں مضر ہوگا۔''

کیا یہ درست ہے کہ اُردو اور ہندی دو مختلف زبانیں ہوچکی ہیں؟ ہمیں اس کا جائزہ لینا ہوگا۔ اور اگر یہ درست ہے تو پھر ہمیں یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ کیا دونوں زبانوں کا مزاج ایک رہا ہے یا وہ بھی مختلف ہو چکا ہے؟ اس لیے کہ اگر اُردو اور ہندی دو مختلف زبانیں ہوچکی ہیں تو پھر یہ بھی لازم ہے کہ اُن کا مزاج بھی مختلف ہو۔ لہٰذا اگر دونوں کا مزاج مختلف ہے تو ایک بات ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ رسم الخط، زبان کے مزاج کے مطابق ہوتا ہے اور کسی زبان کے لیے جو رسم الخط صدیوں تک استعمال ہوتا رہتا ہے، اُس میں اور اُس زبان میں طرح طرح کے بہت گہرے اور دُور تک پہنچنے والے تعلق قائم ہوجاتے ہیں۔ اس لیے رسم الخط کے بدل جانے سے زبان کی صورت کے ساتھ اُس کی روح کا بدل جانا بھی ضروری ہے۔

تو کیا دیوناگری خط اپنانے سے اُردو زبان کے مزاج پر اثرات مرتب نہیں ہوں گے؟ اور اگر اثرات مرتب ہوں گے تو اُس کی روح کو متاثر نہیں کریں گے؟

خالص لسانیاتی نقطۂ نظر سے اُردو رسم الخط کی حمایت میں ایک بات یہ بھی کہی جاتی ہے کہ یہ دیوناگری کی بہ نسبت کم وقت اور کم جگہ گھیرتا ہے کیونکہ اُردو خط تیزی سے لکھا اور پڑھا جاسکتا اور آج کل کی تیز رفتار اور اقتصادی صورت حال کے پیش نظر اس بات کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ لہٰذا ہمیں یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ ناگری خط اپنانے کی صورت میں اس مسئلے کا تدارک کیسے کیا جاسکتا ہے؟

اگر ذکر ہوتا ہے کہ اُردو رسم الخط میں کچھ دشواریاں ہیں تو اس کے طرف داروں کا کہنا ہے کہ دنیا کا وہ کون سا رسم الخط ہے جو اصلاح طلب نہیں؟ اور اس میں پیچیدگیاں نہیں؟ اُردو خط بھی ان پیچیدگیوں سے پاک نہیں لیکن انہیں دُور کیا جاسکتا ہے نہ کہ رسم الخط ہی تبدیل کردیا جائے۔

بہرحال اب ہم سب سے اہم سوال کی طرف آتے ہیں کہ کیا کسی رسم الخط کو شعوری طور پر تبدیل کرکے لاگو کیا جاسکتا ہے؟ اور کیا اُس کے مثبت اور دُور رس نتائج حاصل کیے جاسکتے ہیں؟ آپ یہاں ترکی کا حوالہ دے سکتے ہیں کہ وہاں شعوری طور پر رسم الخط کی تبدیلی عمل میں لائی گئی لیکن ہمیں یہ بھی دیکھنا ہے کہ اس کا فائدہ ترکی زبان کو کیا پہنچا ہے؟ اور ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ اُن کی یہ تبدیلی سیاسی دباؤ کے تحت عمل میں لائی گئی تھی، کسی متفقہ ادبی فیصلہ کا نتیجہ نہیں تھی۔

ماہرین کا خیال ہے کہ رسم الخط میں شعوری تبدیلی اوّل تو لائی نہیں جاسکتی اور اگر یہ تبدیلی جبراً لاگو کی جائے تو زبان کے لیے انتہائی مضر ہوسکتی ہے۔ رسم الخط میں تغیر غیر شعوری طور پر ہوتا ہے اور ضرورت کے تحت اس میں ردوبدل یا تبدیلی خود بخود پیدا ہوتی رہتی ہے۔

اب اگر یہ درست ہے کہ اُردو، دیوناگری لباس میں ہی زندہ رہے گی تو کیا پھر یہ تبدیلی خود بخود رونما نہیں ہوجائے گی؟ ہمارا اس کے لیے متفکر ہونا کہاں تک جائز ہے؟

اُسی کے ساتھ یہ فیصلہ بھی کرلینا چاہیے کہ رسم الخط، زبان کا لباس ہی ہے جیسا کہ شاعرؔ

صاحب نے لکھا یا یہ زبان کی جلد یا کھال کی مانند ہے جیسا کہ دوسرے ماہرین کا خیال ہے۔

میرے خیال میں، ہمیں بغیر کیس تعصب کے، بغیر کسی زبان کا یا رسم الخط کا استحصال کیے یہ فیصلہ کرنا ہے کہ اُردو کی بقاء اور فروغ کن عوامل میں پوشیدہ ہے۔ کیا اُردو زبان کی بقاء محض رسم الخط کی تبدیلی سے ہی ممکن ہے؟ اگر ایسا ہے تو پھر تجزیاتی انداز سے یہ دیکھنا ہوگا کہ کس رسم الخط سے اُردو کی نشو ونما زیادہ بہتر انداز سے ہوسکتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ تمام مسائل اور مشکلات حل کرنے کا ٹھوس پروگرام بھی ہمارے پاس موجود ہونا چاہیے۔ رسم الخط کے زبان سے فلسفیانہ، تاریخی، سماجی، لسانی، نفسیاتی اور بشریاتی تعلق کو پیش نظر رکھتے ہوئے کسی نتیجے تک پہنچنا ہوگا۔ کسی تعصب کے تحت یا اندھی تقلید یا بے جا حمایت میں کیا گیا کوئی فیصلہ بھی مفید ثابت نہ ہوگا۔

ہمارے پاس کسی بھی عمل کے ٹھوس علمی و عقلی دلائل موجود ہونے چاہئیں اور اُس کے اطلاق کا ایسا عملی پروگرام ہو جو ممکن الحصول ہو۔ یعنی رسم الخط کے بارے میں جو بھی فیصلہ کیا جائے وہ مضبوط بنیادوں اور ٹھوس دلائل پر مبنی ہو اور راہ میں حائل رکاوٹوں کو عبور کرنے پر قادر ہو۔

جیسا میں نے شروع میں عرض کیا کہ میرا مقصد اُردو رسم الخط کی محض حمایت کرنا نہیں ہے بلکہ مسئلہ کی اصل تہہ تک پہنچنا اور اُس کا کوئی صحت مندانہ حل تجویز کرنا ہے اور اس کے لیے ہمیں ممکنہ حد تک تعصّبات سے گریز اور تجزیاتی انداز کو اپنانا ہوگا۔ حتیٰ کہ اس ضمن میں ہمیں اپنا یہ نفسیاتی تجزیہ بھی کرنا چاہیے کہ اُردو رسم الخط کی حمایت میں کہیں ہماری یہ نفسیاتی پیچیدگی تو کارفرما نہیں کہ ہم اس رسم الخط میں لکھنے اور پڑھنے کے عادی ہو گئے ہیں اور اب اس عادت سے دستبردار ہونا نہیں چاہتے کیونکہ ایک عادت چھوڑ کر دوسری عادت اختیار کرنا نفسیاتی طور پر کافی تکلیف دہ عمل ہوتا ہے۔

مختصراً کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اُردو کے لیے رسم الخط کی کسی بھی تجویز کا ٹھوس دلائل سے تجزیہ کیا جائے اور کسی نفسیاتی، جذباتی یا تعصّباتی پہلو کو خاطر میں نہ لایا جائے۔

لیکن اس مسئلہ کو (بلکہ کسی بھی مسئلہ کو) میں لسانی، سیاسی اور مذہبی تنگ نظری سے آلودہ کرنے کی حمایت کبھی نہیں کروں گا اور نہ ان پہلوؤں سے اس مسئلہ کے سلجھ جانے کی توقع رکھتا ہوں اور وہ اس لیے کہ سیاسی اور مذہبی تنگ نظری میں لپٹے مسائل کبھی سلجھتے نہیں، ہاں مزید اُلجھ ضرور جاتے ہیں اور شاید اُردو ہندی کا جھگڑا بھی اسی لیے نہیں سلجھ سکا کہ یہ ٹھوس لسانیاتی علم کی بجائے سیاسی اور مذہبی بنیادوں پر کھڑا ہوا۔ لہٰذا اب ہمیں موجودہ صورتِ حال میں اُردو کے رسم الخط کا قضیہ خالص لسانیاتی علم کی بنیادوں پر حل کرنا چاہیے۔ کیونکہ رسم الخط کے معاملے میں لسانیاتی نقطہ نظر ہی کو افضلیت دی جانی قرینِ انصاف ہے۔

جدید لسانیاتی علم میں مشاہدے، تجزیے، گوشواروں اور تجربات کی سہولیات میسر ہیں۔ ہم اِن کی مدد سے بہتر علمی اور عملی نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں اور اسی طرح سیاسی اور مذہبی تعصّبات کی بیخ کنی کی جاسکتی ہے۔

ہمارے لیے نہ تو عرب و عجم کی محبت میں اُردو خط کو سینے سے چمٹانے کا جواز سودمند ثابت ہوگا

اور نہ اُردو رسم الخط کو محض بدیسی رسم الخط کہہ کر ٹھکرا دینے کا عمل قابلِ تحسین ہوگا۔ جو بھی فیصلہ کرنا ہوگا وہ موجودہ صورتِ حال کے پیشِ نظر اور لسانیاتی (علمی) بنیادوں پر کرنا ہوگا۔

آخر میں اتنا کہوں گا کہ پاکستان میں تو اُردو زبان اِسی رسم الخط میں زندہ رہے گی اور اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ یہاں کی بیشتر مقامی زبانوں کا رسم الخط بھی وہی ہے جو اُردو کا۔ اس لیے یہاں اُردو کے رسم الخط کی تبدیلی کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

جہاں تک سوال ہے ہندوستان میں اُردو کے رسم الخط کا، تو میرے خیال میں وہاں یہ ابھی ناگری اور اُردو دونوں شکلوں میں رائج رہے گی اور اس کا تعین آنے والا وقت ہی کرے گا کہ آئندہ اُردو کسی ایک خط کو اپنے لیے منتخب کرتی ہے یا دونوں کو ساتھ لے کر چلتی ہے لیکن یہ بات یقینی طور پر کہی جاسکتی ہے کہ رومن خط میں اُردو زبان کے پاکستان یا ہندوستان، کہیں بھی رائج ہونے کا امکان نہیں۔

(ایم۔فیاض خالد۔گجرات)

''انگارے'' کی گیارہویں کتاب مل گئی ہے، شکریہ بے حد۔

اداریہ میں آپ نے جو چند باتیں کی ہیں انہی میں اصل بات نہاں ہے۔ ہمارا معاشرتی مزاج عجب طرح کا بن گیا ہے کبھی کبھی تو میں سوچتا ہوں کیا واقعی ہم ریوروڑوں کے ہم مزاج ہو گئے ہیں۔ اہلِ دانش نے ندرت فکر و عمل کو ذوقِ انقلاب کا نام دیا ہے اور ندرت ہماری فکر میں رہی ہے نہ عمل میں ___ انقلاب کہاں سے آئیگا ___ ویسے بھی حالات اور ماحول کو بدل دینے والے لوگ لکیر کے فقیر کبھی نہیں ہوا کرتے وہ تو ہواؤں کا رُخ بدل دینے کی جرأت و عزیمت رکھتے ہیں۔ استقامت ان کے مزاج کا رواج ہوتی ہے اور حوصلوں کو ولولوں میں بدل دینے کا سلیقہ ان کی حیات کا اثبات اس طور کراتا ہے کہ آنیوالا دور ان کی کامرانیوں کی کہانیوں سے بھر جاتا ہے۔ داغستان کے دانشور شاعر رسول حمزہ نے کیا خوبصورت بات کہی ___ ''کامیابی اپنے ہاتھ کے تیشے سے کھودلائی جوئے شیر کا نام ہے'' ___ مجھے محسن نقوی بھی بہت پیارا لگا جب اس نے کہا۔

جس کو طوفان سے الجھنے کی ہو عادت محسن ایسی کشتی کو سمندر بھی دعا دیتا ہے!

مگر ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم ہواؤں کا رُخ، تغیر کے لئے نہیں تقلید کے لئے پہچاننے کی کوشش کرتے ہیں ___ جب تک کوئی فرد یا قوم اپنی ترجیحات خود متعین نہیں کرتی۔ اس کی کامیابی کا خواب تعبیر سے کوسوں دور رہتا ہے۔ ہمارے ہاں یہی ہوا ہے ___ ہوتا آیا ہے اور ہو رہا ہے ___ انفارمیشن ٹیکنالوجی اور کمپیوٹر لٹریسی کی اہمیت اپنی جگہ مگر سماجی علوم تو ہر زمانے کے آسمان پر درخشاں وہ نجوم رہے ہیں جن کی روشنی میں قوموں کے کارواں سمتِ سفر کا تعین کیا کرتے ہیں ___ ہوا در اصل یہ ہے کہ ہم نے تمدن کی بنیادی قدروں سے روگردانی کر لی ہے۔ ایلون ٹافلر کی بات میرے دل کو بہت سچی لگتی ہے ___ ''معاشرہ روپے پیسے کی ریل پیل سے نہیں، علم کی ثروت سے خوشحال ہوتا ہے ___'' ہم نے جب سے روپے پیسے کی دولت کو

معاشرت کی بنیادی اور مرکزی قدر بنالیا ہے ہماری ترجیحات بدل گئی ہیں۔اب زندگی کا محور انسان نہیں پیسہ ہوگیا ہے۔مشینوں کی محبت نے دلوں کو مردہ کردیا ہے۔روپے کمانے کی بھگدڑ نے انسانوں کو بے حال کر کے رکھ دیا ہے۔احساس اور جذبہ ایسی اساسی انسانی صفات کچلی جارہی ہیں اور ہر اُس راستہ کی طرف دوڑ تیزی سے جاری ہے جو سرمایہ کاری اور منفعتِ مال کے احوال سے بھرا ہوا ہو۔یہی کچھ ہم اپنی زراعت کو ترقی دے کر بھی بطریق احسن کر سکتے تھے مگر اُس غلامانہ ذہنیت کا کیا کیا جائے جو لارڈ میکالے کے نظام اور حرص آلود فکر و کلام نے ہمارے بطون میں جاگزیں کر رکھی ہے___ تہذیب کی اپنی ایک ترتیب ہوتی ہے جسے ناظم حکمت نے حیات افروز کہا تھا اور جسے پشکن کی شاعری میں تمدنی دانائی کا نام دیا گیا ہے۔معاشرے اسی تہذیب و ثقافت سے سربلند زندگی کی بشارت حاصل کرتے ہیں! لیکن ان آفاقی سچائیوں پر تو نظر تب جائے جب ہم عطا شدہ عینک اُتار کر اپنی آنکھوں سے ماحول کو دیکھیں، اپنے ذہن سے حالات پر غور کریں۔اپنے ارادوں کو ولولوں میں بدل دینے کی صلاحیت بیدار کریں اور خود اعتماد زندگی کی تابندگی سے دوستی کریں مگر ہوا یہ ہے کہ ہم نے ''گندے انڈوں'' جیسی تہذیب کی اندھا دھند تقلید کو زیست کا شعار بنالیا ہے___ ہمارا معاشرہ جدّتِ افکار سے محروم ہو کر ٹامک ٹوئیاں مارنے والوں کا ہجوم بن کر رہ گیا ہے۔ترقی یافتہ قومیں ہمیشہ اعتدال کے جمال سے کمال حاصل کرتی ہیں۔سماجی علوم اور عصر حاضر کے تقاضے ایک ساتھ ہماری نظر میں رہنا چاہیے تھے لیکن ہم نے عدم توازن کے گڑھے میں گر کر خود کو بے دست و پا کرلیا ہے۔شاید گلزار بخاری نے ایسی ہی صورت حال میں کہا ہو۔

شجر بے دست و پا ہیں ابتلا کو کون روکے گا ہوا پتے گرائے گی ہوا کو کون روکے گا

(محمد فیروز شاہ۔میانوالی)

''انگارے'' کی گیارہویں کتاب میرے سامنے ہے۔''چند باتیں'' دل اور ذہن کو لگتی ہیں اور بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتی ہیں۔اس بار شامل مضامین بہت معیاری اور جاندار ہیں۔خاص کر حمایت علی شاعر کا ''چراغِ آخر شب'' ڈاکٹر روبینہ ترین کا ''فراق اپنی نظر میں'' اور شوکت نعیم قادری کا ''ڈاکٹر سید عبداللہ اور ناول'' قابلِ ذکر ہیں۔شوکت نعیم قادری کا مضمون زیادہ اہم ہے، ڈاکٹر سید عبداللہ کی ناول کے بارے میں یہ رائے ''ناول بعض انسانوں کے بدنما (اگرچہ مکمل) مجسمے تیار کرتا ہے اور انسانیت کے خلاف سچائی کے نام پر شدید بدظنی پیدا کرتا ہے'' ڈاکٹر صاحب کی یہ رائے حیران کن اور عجیب سی ہے۔ایک مثالی استاد اور تنقید نگار کی ناول کے بارے میں یہ رائے پریشان کرتی ہے۔شوکت نعیم قادری نے اس رائے کے ردِعمل میں بہت سے سوال اُٹھائے ہیں جو دعوتِ فکر دیتے ہیں۔رانی آکاش ہاشمی کی کہانی ''رحمت کا فرشتہ'' متاثر کرتی ہے۔قیوم طاہر کی غزل اور شانی فریاد کی نظم قابل داد ہے، ڈاکٹر انور سدید اور احمد صغیر صدیقی کے خطوط قابل ذکر ہیں۔

(خالد ریاض خالد۔ملتان)